ہمفرے کے اعترافات



ہمفرے کے اعترافات

COLONIZATION IDEAL

MR. HUMPHREY'S MEMOIRS

The English spy in Islamic Countries

۱

مدّتوں حکومتِ برطانیہ اپنی عظیم اور مستحکم نوآبادیوں کے بارے میں فکرمند رہی اور اس کی سلطنت کے حدود نے اتنی وسعت اختیار کی کہ اب وہاں سورج بھی غروب نہیں ہوتا تھا لیکن ہندوستان، چین اور مشرقِ وسطیٰ کے ممالک اور دیگر بے شمار نوآبادیوں کے ہوتے ہوئے بھی جزیرۂ برطانیہ بہت چھوٹا دکھائی دیتا تھا۔ حکومت برطانیہ کی سامراجی پالیسی بھی ہر ملک میں یکساں نوعیت کی نہیں ہے۔ بعض ممالک میں عناں حکومت ظاہراً وہاں کے لوگوں کے ہاتھ میں ہے لیکن درپردہ پورا سامراجی نظام کارفرما ہے اور اب اس میں کوئی کسر باقی نہیں ہے کہ وہ ممالک اپنی ظاہری آزادی کھوکر برطانیہ کی گود میں چلے آئیں۔ اب ہم پر لازم ہے کہ ہم اپنے نوآبادیاتی نظام پر نظرثانی کریں اور خاص طور سے دو باتوں پر لازمی توجہ دیں:

۱۔ ایسی تدابیر اختیار کریں جو سلطنت انگلستان کی نوآبادیوں میں اس کے عمل دخل اور قبضے کو مستحکم کریں۔

۲۔ ایسے پروگرام مرتب کریں جن سے ان علاقوں پر ہمارا اثر و رسوخ قائم ہو جو ابھی ہمارے نوآبادیاتی نظام کا شکار نہیں ہوتے ہیں۔

انگلستان کی نوآبادیاتی علاقوں کی وزارت نے مذکورہ پروگراموں کو روبہ عمل لانے کے لیے اس بات کی ضرورت محسوس کی کہ وہ نوآبادیاتی یا غیر نوآبادیاتی علاقوں میں جاسوسی اور حصول اطلاعات کے لیے وفود روانہ کرے۔ میں نے نوآبادیاتی علاقوں کی وزارت میں ملازمت کے شروع ہی سے حسن کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔ خاص طور پر "ایسٹ انڈیا کمپنی" کے امور کی جانچ پڑتال کے سلسلے میں اچھی کارکردگی نے مجھے وزارت خزانہ میں ایک اچھے عہدے پر فائز کیا۔ یہ کمپنی بظاہر تجارتی نوعیت کی تھی مگر درحقیقت جاسوسی کا اڈہ تھا اور اس کے قیام کا مقصد ہندوستان میں ان صورتوں یا ان راستوں کی تلاش تھی جن کے ذریعے اس سرزمین پر مکمل طور پر برطانیہ کا اثر و نفوذ قائم ہو سکے اور مشرق وسطیٰ پر اس کی گرفت مضبوط کی جا سکے۔

ان دنوں انگلستان کی حکومت ہندوستان سے بڑی مطمئن اور بے فکر تھی کیونکہ قومی، قبائلی، مذہبی اور ثقافتی اختلافات مشرق وسطیٰ کے رہنے والوں کو اس بات کی فرصت ہی کہاں دیتے تھے کہ وہ انگلستان

کے جائز اثر و رسوخ کے خلاف کوئی شورش برپا کر سکیں۔ یہی حال چاپان کی سرزمین کا بھی تھا۔ بُدھ اور کنفیوشس جیسے مُردہ مذاہب کے پیروکاروں کی طرف سے بھی انگریزوں کو کوئی خطرہ لاحق نہیں تھا اور ہند و چاپان میں کثرت سے باہمی بنیادی اختلافات کے پیشِ نظر یہ بات بعید از قیاس تھی کہ وہاں کے رہنے والوں کو اپنی آزادی اور استقلال کی فکر ہو۔ یہی وہ ایک موضوع تھا جو کبھی ان کے لیے قابلِ توجہ نہیں رہا تاہم یہ سوچنا بھی غیر دانشمندی ہے کہ آئندہ کے پیشِ نظر انقلابات بھی ان قوموں کو اپنی طرف متوجہ نہیں کریں گے۔ پس یہ بات سامنے آئی کہ ایسی تدابیر اختیار کی جائیں جن سے ان قوموں میں بیداری کی صلاحیت مفقود ہو جائے۔ یہ تدابیر طویل المیعاد پروگراموں کی صورت میں ان سرزمینوں پر جاری ہوئے جو تمام کے تمام افتراق، جہالت، بیماری اور غربت کی بنیاد پر استوار تھے۔ ہم نے ان علاقوں کے لوگوں پر ان مصیبتوں اور بدبختیوں کو وارد کرتے ہوئے بدھ مت کی اس ضرب المثل کو اپنایا جس میں کہا گیا ہے:

"بیمار کو اس کے اپنے حال پر چھوڑ دو اور صبر کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دو بالآخر وہ دوا کو پوری کڑواہٹ کے باوجود پسند کرنے لگے گا۔"

ہم نے باوجود اسکے کہ اپنے دوسرے بیمار یعنی سلطنت عثمانی سے کئی قراردادوں پر اپنے فائدہ میں دستخط کروا لیے تھے تاہم نوآبادیاتی علاقوں کی وزارت کے ماہرین کا کہنا تھا کہ ایک صدی کے اندر ہی اس

سلطنت کا پلّہ بھڑ سکتا ہے۔ ہم نے اسی طرح ایران سے مختلف قراردادوں پر دستخط لیے۔ ہمارے جاسوس اسلامی ممالک میں عثمانیوں اور اسی طرح ایرانیوں کے زیراثر سرگرم عمل رہے اور باوجود اس کے کہ انہوں نے انگریزی حکومت کے مقاصد میں نمایاں کامیابیاں حاصل کیں اور دفتروں کے نظام کو بگاڑ کر رشوت ستانی عام کر دی، بادشاہوں کے عیش و عشرت کے سامان فراہم کیے اور اس طرح ان حکومتوں کی بنیادوں کو کسی حد تک پہلے سے زیادہ متزلزل کیا تاہم عثمانی اور ایرانی سلطنتوں کی کمزوری کو سامنے رکھتے ہوئے بھی ذیل میں بیان کیے جانے والے بعض وجوہات کی بنا پر ہم اپنے حق میں کچھ زیادہ مطمئن نہیں تھے اور وہ اہم ترین وجوہات یہ تھے:

۱۔ لوگوں میں اسلام کی حقیقی روح کا اثر و نفوذ جس نے انھیں بہادر، بے باک اور پُرعزم بنا دیا تھا اور یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ایک عام مسلمان، مذہبی بنیادوں پر ایک پادری کا ہم پلّہ تھا۔ یہ لوگ کسی صورت بھی اپنے مذہب سے دستبردار نہیں ہوتے تھے۔ مسلمانوں میں شیعہ مذہب کے پیرو کار جن کا تعلق ایران کی سرزمین سے ہے، عقیدے اور ایمان کے اعتبار سے زیادہ محکم اور زیادہ خطرناک واقع ہوئے ہیں۔
شیعہ حضرات عیسائیوں کو نجس اور کافر مطلق سمجھتے

ہیں[1]۔ ان کے نزدیک ایک عیسائی ایسی متعفن غلاظت کی حیثیت رکھتا
ہے جسے اپنے درمیان سے ہٹانا ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے۔ ایک
دفعہ میں نے ایک مسلمان شیعہ سے پوچھا:

"تم لوگ نصاریٰ کو حقارت کی نگاہ سے کیوں دیکھتے ہو
حالانکہ وہ لوگ خدا، رسول اور روزِ قیامت پر
ایمان رکھتے ہیں؟"

اس نے جواب دیا:

"حضرت محمدؐ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صاحبِ علم اور صاحبِ
حکمت پیغمبر تھے اور وہ چاہتے تھے کہ اس انداز سے کافروں
پر دباؤ ڈالیں کہ وہ دینِ اسلام قبول کرنے پر مجبور ہو جائیں"

سیاسی میدان میں بھی جب کبھی حکومتوں کو کسی فرد یا گروہ سے کھٹکا ہوتا ہے تو وہ اپنے حریف پر سختیاں کرتی ہیں اور اسے راستے سے ہٹنے پر مجبور کرتی ہیں تا کہ بالآخر وہ اپنی مخالفتوں سے باز آجائے اور اپنا سرِ تسلیم خم کر دے۔ عیسائیوں کے نجس اور ناپاک ہونے سے مراد انکی ظاہری

---

[1] یہ الزام سراسر بے بنیاد ہے اور بہ اعتبار اسلام تمام اہل کتاب صاحبان ایمان ہیں:

اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰھُمُ الْکِتٰبَ یَتْلُوْنَہٗ حَقَّ تِلَاوَتِہٖ اُولٰٓئِکَ یُؤْمِنُوْنَ بِہٖ (سورہ بقرہ۔ آیت ۱۲۱)

ناپاکی نہیں بلکہ باطنی ناپاکی ہے اور یہ بات صرف عیسائیوں ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ اس میں زرتشتی بھی شامل ہیں جو قومی اعتبار سے ایرانی ہیں، اسلام انھیں بھی "ناپاک" سمجھتا ہے۔

میں نے کہا:

"اچھا! مگر عیسائی تو خدا، رسول اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں۔

اس نے جواب دیا:

"ہمارے پاس انھیں کافر اور نجس گرداننے کے لیے دو دلیلیں ہیں۔ پہلی دلیل تو یہ ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کو نہیں مانتے اور کہتے ہیں محمدؐ (نعوذ باللہ) جھوٹے ہیں۔ ہم بھی ان کے جواب میں کہتے ہیں کہ تم لوگ ناپاک اور نجس ہو اور یہ تعلق عقل کی بنیاد پر ہے" کیونکہ "جو تمھیں دکھ پہنچائے تم بھی اسے تکلیف دو۔"

دوسرے یہ کہ عیسائی انبیاء و مرسلینؑ پر جھوٹی تہمتیں باندھتے ہیں جو خود ایک بڑا گناہ اور ان کی بے حرمتی ہے، مثلاً وہ کہتے ہیں:

"حضرت عیسیٰؑ (نعوذ باللہ) شراب پیتے تھے، اس لیے لعنت الٰہی میں گرفتار ہوتے اور انھیں سولی دی گئی۔"

مجھے اس بات پر بڑا تاؤ آیا اور میں نے کہا:

"عیسائی ہرگز یہ نہیں کہتے۔"

اس نے کہا:

"تم نہیں جانتے "کتاب مقدس" میں یہ تمام تہمتیں وارد ہیں"

اس کے بعد اس نے کچھ نہیں کہا اور مجھے یقین تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ اگرچہ میں نے سنا تھا کہ بعض افراد نے پیغمبر اسلامؐ پر جھوٹ کی نسبت دی ہے لیکن میں اس سے زیادہ بحث نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مجھے خوف تھا کہ کہیں میرا بھانڈا نہ پھوٹ جائے اور لوگ میری اصلیت سے واقف نہ ہو جائیں۔

۲۔ مذہب اسلام تاریخی پس منظروں کی بنیاد پر ایک حریت پسند مذہب ہے اور اسلام کے سچے پیروکار آسانی کے ساتھ غلامی قبول نہیں کرتے۔ ان کے پورے وجود میں گزشتہ عظمتوں کا غرور سمایا ہوا ہے یہاں تک کہ اپنے اس ناتوانی اور پُر فتور دور میں بھی وہ اس سے دستبردار ہونے پر تیار نہیں ہیں۔ ہم اس بات پر قادر نہیں ہیں کہ تاریخِ اسلام کی من مانی تفسیر پیش کرکے انھیں یہ بتائیں کہ تمھاری گزشتہ عظمتوں کی کامیابی ان حالات پر منحصر تھی جو اس زمانے کا تقاضا تھا مگر اب زمانہ بدل چکا ہے اور نئے تقاضوں نے ان کی جگہ لے لی ہے اور اب گزشتہ دور میں واپسی ناممکن ہے۔

۳۔ ہم ایرانی اور عثمانی حکومتوں کی دوراندیشیوں، ہوشیاریوں

اور کارروائیوں سے محفوظ نہیں تھے اور ہر آن یہ کھٹکا تھا کہ کہیں وہ ہماری سامراجی پالیسیوں سے باخبر ہو کر ہمارے کیے دھرے پر پانی نہ پھیر دیں۔ یہ دونوں حکومتیں جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے بہت کمزور ہو چکی تھیں اور ان کا اثر و رسوخ صرف اپنی سرزمین کی حد تک محدود تھا۔ وہ صرف اپنے ہی علاقے میں ہمارے خلاف اسلحہ اور پیسہ جمع کر سکتے تھے تاہم ان کی بدگمانی ہماری آئندہ کامیابیوں کے لیے عدم اطمینان کا سبب تھی۔

۲۔ مسلمان علماء بھی ہماری تشویش کا باعث تھے۔ جامعہ الازہر کے مفتی اور ایران و عراق کے شیعہ مراجع ہمارے سامراجی مقاصد کی راہ میں ایک عظیم رکاوٹ تھے۔ یہ علماء جدید علم و تمدن اور اور نئے حالات سے یکسر بے خبر تھے اور ان کی تنہا توجہ اس جنت کے لیے تھی جس کا وعدہ قرآن نے انھیں دے رکھا تھا۔ یہ لوگ اس قدر متعصب تھے کہ اپنے موقف سے ایک انچ پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں تھے۔ بادشاہ اور امراء سمیت تمام افراد ان کے آگے چھوٹے تھے۔ اہل سنّت حضرات شیعوں کی نسبت اپنے علماء سے اس قدر خوفزدہ نہیں تھے اور ہم دیکھتے ہیں کہ عثمانی سلطنت میں بادشاہ اور شیخ الاسلام کے درمیان ہمیشہ خوشگوار تعلقات برقرار رہے تھے اور علماء کا زور سیاسی حکام کے زور کے ہم پلّہ تھا لیکن شیعی ممالک میں لوگ بادشاہوں سے زیادہ

علماء کا احترام کرتے تھے۔ مذہبی علماء سے ان کا لگاؤ ایک تفننی لگاؤ تھا لیکن حکام یا سلاطین کو وہ کچھ زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے۔ بہرحال سلاطین اور علماء کی قدردانی سے متعلق شیعہ اور سنی نظریات کا یہ فرق نوآبادیاتی علاقوں کی وزارت اور انگریزی حکومت کی شورش میں کمی کا باعث نہیں تھی۔

ہم نے کئی بار ان ممالک کے ساتھ آپس کی پیچیدہ دشواریوں کو دور کرنے کے سلسلے میں گفتگو کی لیکن ہمیشہ ہماری گفتگو نے بدگمانی کی صورت اختیار کی اور ہم نے اپنا راستا بند پایا۔ ہمارے جاسوسوں اور سیاسی کارکنوں کی درخواستیں بھی سابقہ مذاکرات کی طرح ناکام رہیں لیکن پھر بھی ہم ناامید نہیں ہوئے کیونکہ ہم ایک مضبوط اور پرشکیبا قلب کے مالک ہیں۔

مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ نوآبادیاتی علاقوں کے وزیر نے لندن کے ایک مشہور پادری اور ۲۵ دیگر مذہبی سربراہوں کے ساتھ ایک اجلاس منعقد کیا جو پورے تین گھنٹے تک جاری رہا اور جب یہاں بھی کوئی خاطرخواہ نتیجہ برآمد نہ ہوسکا تو پادری نے حاضرین سے مخاطب ہوکر کہا:

"آپ لوگ اپنی ہمتیں پست نہ کریں، صبر اور حوصلہ سے کام لیں، عیسائیت تین سو سال کی زحمتوں اور دربدری کے ساتھ حضرت عیسیٰؑ اور ان کے پیروکاروں

کی شہادت کے بعد عالمگیر ہوئی۔ ممکن ہے آئندہ حضرت عیسیٰؑ کی نظرِ عنایت ہم پر ہو اور ہم تین سو سال بعد کافروں کو نکالنے میں کامیاب ہوں۔ پس ہم پر لازم ہے کہ ہم اپنے آپ کو محکم ایمان اور پائیدار صبر سے مزین کریں اور ان تمام وسائل کو بروئے کار لائیں جو مسلمان خطوں میں عیسائیت کی ترویج کا سبب ہوں۔ اگر اس میں ہمیں صدیوں کا عرصہ بھی گزر جائے تو گھبرانے کی کوئی بات نہیں، آباؤ اجداد اپنی اولاد کے لیے بیج بوتے ہیں۔"

ایک دفعہ پھر نوآبادیاتی علاقوں کی وزارت میں روس، فرانس اور برطانیہ کے اعلیٰ رتبہ نمائندوں پر مبنی کانفرنس کا انعقاد ہوا۔ کانفرنس کے شرکاء میں سیاسی وفود، مذہبی شخصیتیں اور دیگر مشہور ہستیاں شامل تھیں۔ حُسنِ اتفاق سے میں بھی وزیر سے قریبی تعلقات کی بنا پر اس کانفرنس میں شریک تھا۔ موضوعِ گفتگو اسلامی ممالک میں سامراجی نظام کی ترویج اور اس میں پیش آنے والی دشواریاں تھا۔

شرکاء کا غور و فکر اس بات میں تھا کہ ہم کس طرح مسلم طاقتوں کو درہم برہم کر سکتے ہیں اور ان کے درمیان نفاق کا بیج بو سکتے ہیں۔ گفتگو ان کے ایمان کے تزلزل کے سلسلے میں تھی۔ بعض لوگوں کا خیال

تھا کہ مسلمانوں کو اسی طرح راہ راست پہ لایا جا سکتا ہے جس طرح اسپین کئی صدیوں کے بعد عیسائیوں کی آغوش میں چلا آیا تھا۔ کیا یہ وہی ملک نہیں تھا جسے وحشی مسلمانوں نے فتح کیا تھا؟ کانفرنس کے نتائج زیادہ واضح نہیں تھے۔ میں نے اس کانفرنس میں پیش آنے والے تمام واقعات کو اپنی کتاب "عظیم مسیح کی سمت ایک پرواز" میں بیان کر دیا ہے۔

حقیقتاً مشرق سے مغرب تک پھیلاؤ رکھنے والے عظیم اور تناور درخت کی جڑوں کو کاٹنا اتنا آسان کام نہیں۔ پھر بھی ہمیں ہر قیمت پہ ان دشواریوں کا مقابلہ کرنا ہے کیونکہ عیسائی مذہب اسی وقت کامیاب ہو سکتا ہے جب ساری دنیا اس کے قبضہ میں آ جائے۔ حضرت عیسیٰؑ نے اپنے سچے پیروکاروں کو اس جہانگیری کی بشارت دی ہے۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی کامیابی ان اجتماعی اور تاریخی حالات سے وابستہ تھی جو اُس دور کا تقاضا تھا۔ ایران و روم سے وابستہ مشرق و مغرب کی سلطنتوں کا انحطاط دراصل بہت کم عرصے میں حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی کامیابی کا سبب بنا۔ مسلمانوں نے ان عظیم سلطنتوں کو زیر کیا، مگر اب حالات بالکل مختلف ہو چکے ہیں اور اسلامی ممالک بڑی تیزی سے رو بہ زوال ہیں اور اس کے مقابلے میں عیسائی روز بروز ترقی کی راہ پر گامزن ہیں۔ اب وہ وقت آ گیا ہے کہ عیسائی مسلمانوں سے اپنا بدلہ چکائیں اور اپنی کھوئی ہوئی عظمت دوبارہ

حاصل کریں۔ اس وقت سب سے بڑی عیسائی حکومت عظیم برطانیہ
کے ہاتھ میں ہے جو دنیا کے طول و عرض میں اپنا سکہ جمائے ہوئے
ہے اور اب چاہتا ہے کہ اسلامی مملکتوں سے نبرد آزمائی کا پرچم بھی
اسی کے ہاتھ میں ہو۔

۲

سنہ ۱۷۱۰ء میں انگلستان کی نوآبادیاتی علاقوں کی وزارت نے مجھے مصر، عراق، ایران، حجاز اور عثمانی خلافت کے مرکز استنبول[1] کی جاسوسی پر مامور کیا۔ مجھے ان علاقوں میں وہ راہیں تلاش کرنی تھیں جن سے مسلمانوں کو درہم برہم کر کے مسلم ممالک میں سامراجی نظام رائج کیا جا سکے۔ میرے ساتھ نوآبادیاتی علاقوں کی وزارت کے نو اور بہت ہی تجربہ کار جاسوس اسلامی ممالک میں اس کام پر مامور تھے اور بڑی تندہی سے انگریز سامراجی نظام کے تسلّط اور نوآبادیاتی علاقوں میں اپنے اثر و نفوذ کے استحکام کے لیے سرگرم عمل تھے۔ ان وفود کو وافر مقدار میں سرمایہ فراہم کیا گیا تھا۔ یہ لوگ بڑے مرتب شدہ نقشے اور بالکل نئی اور تازہ اطلاعات سے بہرہ مند تھے۔ ان کو امراء، وزراء، حکومت کے اعلیٰ عہدہ داروں

---

[1] آج کا استنبول اس وقت کا قسطنطنیہ تھا۔

اور علماء و رؤسا کے ناموں کی مکمل فہرست دی گئی تھی۔ نوآبادیاتی علاقوں کے معاون وزیر نے ہمیں روانہ کرتے ہوئے خدا حافظی کے وقت جو بات کہی وہ آج بھی مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ اُس نے کہا تھا:

"تمہاری کامیابی ہمارے ملک کے مستقبل کی آئینہ دار ہوگی لہٰذا اپنی تمام قوتوں کو بروئے کار لاؤ تاکہ کامیابی تمہارے قدم چومے"

میں خوشی خوشی بحری جہاز کے ذریعے استنبول کے لیے روانہ ہوا۔ میرے ذمے اب دو اہم کام تھے۔ پہلے ترکی زبان پر عبور حاصل کرنا جو اُن دنوں وہاں کی قومی زبان تھی۔ میں نے لندن میں ترکی زبان کے چند الفاظ سیکھ لیے تھے۔ اس کے بعد مجھے عربی زبان، قرآن، اس کی تفسیر اور پھر فارسی سیکھنا تھی۔ یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ کسی زبان کا سیکھنا اور ادبی قواعد، فصاحت اور مہارت کے اعتبار سے اس پر پوری دسترس رکھنا دو مختلف چیزیں ہیں۔ مجھے یہ ذمہ داری سونپی گئی تھی کہ میں ان زبانوں میں ایسی مہارت حاصل کروں کہ مجھ میں اور وہاں کے لوگوں میں زبان کے اعتبار سے کوئی فرق محسوس نہ ہو۔ کسی زبان کو ایک دو سال میں سیکھا جا سکتا ہے لیکن اس پر عبور حاصل کرنے کے لیے برسوں کا وقت درکار ہوتا ہے۔ میں اس بات پر مجبور تھا کہ ان غیر ملکی زبانوں کو اس طرح سیکھوں کہ اس کے قواعد و رموز کا کوئی نکتہ فروگذاشت نہ ہو اور کوئی میرے ترک، ایرانی یا عرب ہونے پر شک نہ کرے۔

ان تمام مشکلات کے باوجود میں اپنی کامیابی کے سلسلے میں ہراساں نہیں تھا کیونکہ میں مسلمانوں کی طبیعت سے واقف تھا اور جانتا تھا کہ ان کی کشادہ قلبی، حُسنِ ظن اور مہمان نواز طبیعت جو انھیں قرآن و سنت سے ورثے میں ملی تھی انھیں عیسائیوں کی طرح بدگمانی اور بدبینی پر محمول نہیں کرے گی اور پھر دوسری طرف سے عثمانی حکومت اتنی کمزور ہو چکی تھی کہ اب اس کے پاس انگلستان اور غیر ملکی جاسوسوں کی کارروائیاں معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا اور ایسا کوئی ادارہ موجود نہیں تھا جو حکومت کو ان نامطلوب عناصر سے باخبر کر سکے۔ فرمانروا اور اس کے مصاحبین پورے طور پر کمزور ہو چکے تھے۔

کئی مہینے کے تھکا دینے والے سفر کے بعد آخر کار ہم عثمانی دارالخلافہ میں پہنچے۔ جہاز سے اترنے سے قبل میں نے اپنے لیے "محمد" کا نام تجویز کیا اور جب میں شہر کی جامع مسجد میں داخل ہوا تو وہاں لوگوں کے اجتماعات، نظم و ضبط اور صفائی ستھرائی دیکھ کر محظوظ ہوا اور دل ہی دل میں کہا: آخر کیوں ہم ان پاک دل افراد کے آزار کے درپے ہیں؟ اور کیوں ان سے ان کی آسائش چھیننے پر تلے ہوئے ہیں؟ کیا حضرت عیسیٰؑ نے اس قسم کے ناشائستہ امور کی تجویز دی ہے؟ لیکن فوراً ہی میں نے ان شیطانی وسوسوں اور باطل خیالات کو ذہن سے جھٹک کر استغفار کیا اور مجھے خیال آیا کہ میں تو برطانیہ عظمیٰ کی نوآبادیاتی وزارت کا ملازم ہوں اور مجھے اپنے فرائض دیانتداری

سے انجام دینے چاہییں اور منہ سے لگائے ہوئے ساغر کو آخری گھونٹ تک پی جانا ہے۔

شہر میں داخلہ کے فوراً بعد ہی میری ملاقات اہل تسنن کے ایک بڑے پیشوا سے ہوئی۔ اس کا نام احمد آفندی تھا۔ وہ ایک برجستہ صاحبِ فضل اور نیک طینت عالم تھا۔ میں نے اپنے پادریوں میں ایسی بزرگوار ہستی نہیں دیکھی تھی۔ وہ دن رات عبادت میں مشغول رہتا تھا اور بزرگی اور برتری میں حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی مانند تھا۔ وہ رسولِ خداؐ کو انسانیت کا مظہرِ کامل سمجھتا تھا اور آپؐ کی سُنّت کو اپنی زندگی کا مطمحِ نظر بنائے ہوئے تھا۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا نام آتے ہی اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ جاتی تھی۔ شیخ کے ساتھ ملاقات میں میری ایک خوش نصیبی یہ بھی تھی کہ اس نے مجھ سے ایک دفعہ بھی میرے حسب نسب اور خاندان کے بارے میں سوال نہیں کیا اور ہمیشہ مجھے محمد آفندی کے نام سے پکارتا تھا۔ جو کچھ میں اس سے پوچھتا تھا، بڑے وقار اور شرافت سے جواب دیتا تھا اور مجھے بہت چاہتا تھا۔ خاص طور سے جب اسے معلوم ہوا کہ میں غریب الوطن ہوں اور اس عثمانی سلطنت کے لیے کام کر رہا ہوں جو پیغمبرؐ کی جانشین ہے تو مجھ پر اور بھی مہربان ہو گیا (یہ وہ جھوٹ تھا جو میں نے استنبول میں اپنے قیام کی توجیہہ بیان کرتے ہوئے

شیخ کے سامنے بولا تھا)۔

اس کے علاوہ میں نے شیخ سے یہ بھی کہا تھا کہ میں بن ماں باپ کا ایک نوجوان ہوں۔ میرے کوئی بہن بھائی نہیں ہیں۔ میں بالکل اکیلا ہوں لیکن میرے والدین نے ورثہ میں میرے لیے بہت کچھ چھوڑا ہے۔ میں نے ارادہ کیا ہے کہ قرآن اور ترکی اور عربی زبان سیکھنے کے لیے اسلام کے مرکز یعنی استنبول کا سفر اختیار کروں اور پھر دینی اور معنوی سرمایہ کے حصول کے بعد مادی کاروبار میں پیسہ لگاؤں۔ شیخ احمد نے مجھے مبارکباد دی اور چند باتیں کہیں جنہیں میں اپنی نوٹ بک سے یہاں نقل کررہا ہوں:

اے نوجوان! مجھ پر تمھاری پذیرائی اور احترام کئی وجوہات کی بنا پر لازم ہے اور وہ وجوہات یہ ہیں:

۱۔ تم ایک مسلمان ہو اور مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں[۱]۔

۲۔ تم ہمارے شہر میں مہمان ہو اور پیغمبر اسلامؐ کا ارشاد ہے: مہمان کو محترم جانو[۲]۔

۳۔ تم طالب علم ہو اور اسلام نے طالب علم کے احترام کا حکم دیا ہے۔

تم حلال روزی کمانا چاہتے ہو اور اس پر "کاروبار کرنے والا اللہ کا دوست ہے" کی حدیث صادق آتی ہے[۳]۔

۱۔ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ۔ ۲۔ اَکْرِمُوا الضَّیْفَ۔

۳۔ اَلْکَاسِبُ حَبِیْبُ اللّٰہِ۔

اس پہلی ملاقات ہی میں شیخ نے اپنے اعلیٰ خصائل کی بنیاد پر مجھے اپنا گرویدہ بنالیا تھا۔ میں نے اپنے دل میں کہا: کاش عیسائیت بھی ان آشکار حقیقتوں سے آشنا ہوتی لیکن دوسری طرف میں یہ دیکھ رہا تھا کہ اسلامی شریعت اتنی بلند نگاہی اور بلند مقامی کے باوجود روبہ زوال ہورہی تھی اور اسلامی حکمرانوں کی نالائقی، ظلم وستم، بدأطواری اور پھر علمائے دین کا تعصّب اور دنیا کے حالات سے ان کی بے خبری انھیں یہ دن دکھارہی تھی۔ میں نے شیخ سے کہا:

"اگر آپ کی اجازت ہو تو میں آپ سے عربی زبان اور قرآن مجید سیکھنے کا خواہشمند ہوں۔"

شیخ نے میری ہمّت افزائی کی اور میری خواہش کا استقبال کیا اور سورۂ حمد کو میرے لیے پہلا سبق قرار دیا اور بڑی گرمجوشی کے ساتھ آیتوں کی تفسیر و تاویل پیش کی۔ میرے لیے بہت سے عربی الفاظ کے تلفّظ دشوار تھے اور کبھی یہ دشواری بہت بڑھ جاتی تھی۔ وہ بار بار مجھ سے کہتا تھا کہ میں عربی عبارت اس طرح تمھیں نہیں سکھاؤں گا تمہیں ہر مشکل لفظ کو دس مرتبہ تکرار کرنا ہوگا تاکہ الفاظ تمہارے ذہن نشین ہوجائیں۔

شیخ نے مجھے حروف کو ایک دوسرے سے ملانے کے طریقے سکھائے۔ مجھے قرآن کی تجوید و تفسیر سیکھنے میں دوسال کا عرصہ لگا۔ درس شروع کرنے سے پہلے وہ خود بھی وضو کرتا تھا اور مجھے بھی وضو کرنے کا حکم

دیتا تھا۔ پھر ہم قبلہ رُخ بیٹھ جاتے تھے اور درس کا آغاز ہوتا تھا۔ یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ اسلام میں اعضاء کو ایک خاص ترتیب سے دھونے کا نام وضو ہے۔ ابتداء میں منہ دھویا جاتا ہے۔ پھر پہلے سیدھے ہاتھ کو انگلیوں اور بعد میں الٹے ہاتھ سے کہنی تک دھویا جاتا ہے۔ اس کے بعد سر، گردن اور کانوں کے پچھلے حصہ کا مسح کیا جاتا ہے اور آخر میں پیر دھوئے جاتے ہیں۔

وضو کرتے وقت کلّی کرنا اور ناک میں پانی چڑھانا مستحب ہے۔ آداب وضو سے پہلے ایک خشک لکڑی سے دانتوں کا مسواک جو وہاں کی رسم تھی میرے لیے بہت ناگوار تھی اور میں سمجھتا تھا کہ یہ خشک لکڑی دانتوں اور مسوڑھوں کے لیے انتہائی نقصان دہ ہے۔ کبھی کبھی میرے مسوڑھوں سے خون بھی جاری ہو جاتا تھا مگر میں ایسا کرنے پر مجبور تھا کیونکہ وضو سے پہلے مسواک کرنا سنتِ مؤکدہ ہے اور اس کے لیے بہت ثواب اور فضیلت بیان کی گئی ہے۔

میں استنبول میں قیام کے دوران راتوں کو ایک مسجد میں سوتا تھا اور اس کے عوض وہاں کے خادم کو جس کا نام مروان آفندی تھا کچھ رقم دے دیتا تھا۔ وہ ایک بداخلاق، غصہ ور شخص تھا اور اپنے آپ کو پیغمبر اسلامؐ کے ایک صحابی کا ہم نام سمجھتا تھا اور اس نام پر بڑا مفتخر تھا۔ ایک بار اس نے مجھ سے کہا:

"اگر کبھی خدا نے تمہیں صاحب اولاد کیا تو تم اپنے

بیٹے کا نام مروان رکھنا کیونکہ اس کا شمار اسلام کے عظیم مجاہدوں میں ہوتا ہے۔

رات کا کھانا میں خادم کے ساتھ کھاتا تھا اور جمعہ کا تمام دن جو مسلمانوں کی عید اور چھٹی کا دن تھا خادم کے ساتھ گزارتا تھا۔ ہفتہ کے باقی دن ایک بڑھئی کی شاگردی میں کام کرتا تھا اور وہاں سے مجھے ایک حقیر سی رقم مل جایا کرتی تھی۔ میں آدھا دن کام کرتا تھا کیونکہ شام کو مجھے شیخ سے درس لینا ہوتا تھا اس لیے میری دہاڑی بھی آدھی ہوتی تھی۔ اس بڑھئی کا نام خالد تھا۔ دوپہر کو کھانے کے وقت وہ ہمیشہ فاتح اسلام "خالد بن ولید" کا تذکرہ کرتا تھا اور اس کے فضائل و مناقب بیان کرتا تھا اور اسے ان اصحاب پیغمبرؐ میں گردانتا تھا جن کے ہاتھوں مخالفین اسلام نے ہزیمت اٹھائی۔ ہر چند حضرت عمرؓ سے اس کے تعلقات کچھ زیادہ استوار نہ تھے اور اسے یہ کھٹکا تھا کہ اگر خلافت انھیں ملی تو وہ اسے معزول کر دیں گے اور ایسا ہی ہوا۔

لیکن خالد بڑھئی اچھے کردار کا حامل نہ تھا تاہم اپنے دیگر شاگردوں سے کچھ زیادہ ہی مجھ پہ مہربان تھا جس کا سبب مجھے اب تک معلوم نہ ہو سکا۔ شاید اس لیے کہ میں بغیر بیت ولعل کے اس کے ہر کام کو بجا لاتا تھا اور اس سے مذہبی امور یا اپنے کام کے بارے میں کسی قسم کا کوئی بحث و مباحثہ نہیں کرتا تھا۔ کئی بار دکان خالی ہونے پر میں نے محسوس کیا کہ وہ مجھے اچھی نظروں سے نہیں دیکھ رہا ہے۔ شیخ احمد نے مجھ سے کہا تھا کہ اغلام (بدفعلی)

اسلام میں بہت بڑا گناہ ہے لیکن پھر بھی خالد مجھ سے اس فعل کے ارتکاب پر مصر تھا۔

وہ دین و دیانت کا زیادہ پابند نہیں تھا اور درحقیقت صحیح عقیدہ اور صحیح ایمان کا آدمی نہیں تھا۔ وہ صرف جمعہ کے جمعہ نماز پڑھنے مسجد میں جایا کرتا تھا اور باقی دنوں میں اس کا نماز پڑھنا مجھ پر ثابت نہیں تھا۔ بہرحال میں نے اس کی اس بے شرمانہ ترغیب کو رد کیا لیکن کچھ دنوں بعد اس نے یہ فعلِ شنیع اپنی دکان کے ایک اور خوبرو کاریگر کے ساتھ انجام دیا جو ابھی نومسلم تھا اور یہودیت سے اسلام میں وارد ہوا تھا۔

میں روزانہ بڑھئی کی دکان میں دوپہر کا کھانا کھا کر ظہر کی نماز کے لیے مسجد میں چلا جایا کرتا تھا اور وہاں نماز عصر تک رہتا تھا۔ عصر کی نماز سے فارغ ہو کر شیخ احمد کے گھر جایا کرتا تھا اور وہاں دو گھنٹے قرآن خوانی میں صرف کرتا تھا۔ قرآن کے علاوہ عربی اور ترکی زبان بھی سیکھتا تھا اور ہر جمعہ کو ہفتہ بھر کی دھاڑی زکوٰۃ کے عنوان سے شیخ احمد کے حوالے کرتا تھا اور یہ زکوٰۃ درحقیقت شیخ سے میری ارادت اور لگاؤ کا ایک نذرانہ اور شیخ کے درسِ قرآن کا ایک حقیر سا حق الزحمہ تھا۔ قرآن کی تعلیم میں شیخ کا طرزِ درس بے نظیر نوعیت کا تھا۔ اس کے علاوہ وہ مجھے اسلامی احکام کی مبادیات عربی اور ترکی زبان میں سکھاتا تھا۔

جب شیخ احمد کو معلوم ہوا کہ میں غیر شادی شدہ ہوں تو اس نے مجھے شادی کا مشورہ دیا اور اپنی ایک بیٹی میرے لیے منتخب کی لیکن

میں نے بڑے مؤدبانہ انداز سے معذرت چاہی اور اپنے آپ کو شادی کے ناقابل ظاہر کیا۔ میں یہ موقف اختیار کرنے پر مجبور تھا کیونکہ شیخ احمد اپنی بات پر مُصر تھا اور ہمارے تعلقات بگڑنے میں کوئی کسر باقی نہیں رہ گئی تھی۔ شیخ احمد شادی کو پیغمبر اسلامؐ کی سنت سمجھتا تھا اور اس حدیث کا حوالہ دیتا تھا:

"جو کوئی میری سنت سے اعراض کرے وہ مجھ سے نہیں ہے"۔[1]

لہٰذا اس بہانہ کے علاوہ میرے پاس اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ میرے اس مصلحت آمیز جھوٹ نے شیخ کو مطمئن کر دیا اور پھر اس نے شادی سے متعلق کوئی گفتگو نہیں کی اور ہماری دوستی پھر پہلی منزل پر آ گئی۔

دو سال استنبول میں رہنے اور قرآن سمیت عربی اور ترکی زبانوں کو سیکھنے کے بعد میں نے شیخ سے واپس وطن جانے کی اجازت چاہی لیکن شیخ مجھے اجازت نہیں دیتا تھا اور کہتا تھا تم اتنی جلدی کیوں واپس جانا چاہتے ہو؟ یہ ایک بڑا شہر ہے۔ یہاں تمہاری ضرورت کی ہر چیز موجود ہے۔ بربنائے مشیّت الٰہی استنبول میں دین اور دنیا دونوں دستیاب ہیں۔ شیخ نے اپنی گفتگو کے دوران کہا:

---

[1] مَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِیْ فَلَیْسَ مِنِّیْ۔

"اب جبکہ تم اکیلے ہو اور تمہارے ماں باپ اور بہن
بھائی کوئی نہیں تو پھر تم استنبول کو اپنا مسکن کیوں
نہیں بناتے ؟"

بہرحال شیخ کو میرے وہاں رہنے پر بڑا اصرار تھا۔ اسے مجھ سے انس ہو گیا تھا۔ مجھے بھی اس سے بہت دلچسپی تھی مگر اپنے وطن انگلستان کے بارے میں مجھ پر جو ذمہ داریاں عائد تھیں وہ میرے لیے سب سے زیادہ اہم تھیں اور مجھے لندن جانے پر مجبور کر رہی تھیں۔ میرے لیے ضروری تھا کہ میں لندن جا کر نوآبادیاتی علاقوں کی وزارت کو اپنی دو سالہ کارگزاری کی مکمل رپورٹ پیش کروں اور وہاں سے نئے احکامات حاصل کروں۔

استنبول میں دو سال کی رہائش کے دوران مجھے عثمانی حکومت کے حالات پر ہر ماہ ایک رپورٹ لندن بھیجنی پڑتی تھی۔ میں نے اپنی ایک رپورٹ میں بدکردار بڑھئی کے اس واقعے کو بھی لکھا تھا جو میرے ساتھ پیش آیا تھا۔ نوآبادیاتی علاقوں کی وزارت نے جواب میں مجھے یہ حکم دیا: اگر تمہارے ساتھ بڑھئی کا یہ فعل ہمارے لیے منزل مقصود تک پہنچنے کی راہ کو آسان بناتا ہے تو اس کام میں کوئی مضائقہ نہیں۔ جب میں نے یہ عبارت پڑھی تو میرا سر چکرانے لگا اور میں نے سوچا ہمارے افسران کو شرم نہیں آتی کہ وہ حکومت کی مصلحتوں کی خاطر مجھے اس بے شرمی کی ترغیب دیتے ہیں۔ بہرحال میرے پاس کوئی

چارۂ کار نہیں تھا اور ہونٹوں سے لگائے ہوئے اس کڑوے جام کو آخری گھونٹ تک پی جانا تھا تاہم میں نے اس حکم کا کوئی نوٹس نہیں لیا اور لندن کے اعلیٰ عہدہ داروں کی اس بے مہری کی کسی سے شکایت نہیں کی۔ مجھے الوداع کہتے ہوئے شیخ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور اس نے مجھے ان الفاظ کے ساتھ رخصت کیا۔

"خدا حافظ بیٹے! مجھے معلوم ہے کہ اب جب تم لوٹ کر آؤ گے تو مجھے اس دنیا میں نہیں پاؤ گے۔ مجھے نہ بھُلانا۔ انشاء اللہ روزِ محشر پیغمبرِ اسلام ؐ کے حضور ہم ایک دوسرے سے ملیں گے۔"

درحقیقت شیخ احمد کی جُدائی سے میں ایک عرصہ تک آزردہ خاطر رہا اور اس کے غم میں میری آنکھیں آنسو بہاتی رہیں لیکن کیا کیا جا سکتا تھا؟ فرائض کی انجام دہی ذاتی احساسات سے ماورا ہے۔

۳

میرے نو دیگر ساتھیوں کو بھی لندن واپس بُلا لیا گیا تھا مگر بدقسمتی سے ان میں سے صرف پانچ واپس لوٹے تھے۔ باقی ماندہ چار افراد میں سے ایک مسلمان ہو چکا تھا اور وہیں مصر میں رہائش پذیر تھا۔ اس واقعہ کو نوآبادیاتی علاقوں کی وزارت کے سیکرٹری نے مجھے بتایا لیکن وہ اس بات سے خوش تھا کہ مذکورہ شخص نے ان کے کسی راز کا افشاء نہیں کیا تھا۔ دوسرا جاسوس روسی نژاد تھا اور روس پہنچ کر اس نے وہیں بودوباش اختیار کر لی تھی۔ سیکرٹری اس کے بارے میں بڑا فکرمند تھا۔ اسے کھٹکا تھا کہ کہیں یہ روسی نژاد جاسوس جو اب اپنی سرزمین میں پہنچ چکا ہے، ہمارے راز فاش نہ کر دے۔ تیسرا شخص بغداد کے قریب واقع ''عمارہ'' میں ہیضہ سے ہلاک ہو گیا تھا اور چوتھے کے بارے میں کوئی اطلاع موصول نہ ہو سکی تھی۔ نوآبادیاتی علاقوں کی وزارت کو

اس کے بارے میں اس وقت تک اطلاع رہی جب تک وہ یمن کے پایۂ تخت "صنعا" میں رہتے ہوئے مسلسل ایک سال تک اپنی رپورٹیں مذکورہ وزارت کو بھیجتا رہا لیکن اس کے بعد جب کوئی اطلاع موصول نہ ہوئی تو ہر چند کوشش کے باوجود نوآبادیاتی علاقوں کی وزارت کو اس کا کوئی نشان نہ مل سکا۔ حکومت ایک زبردست جاسوس کی گمشدگی کے نتائج سے اچھی طرح باخبر تھی۔ وہ ہر ملازم کے کام کی اہمیت کو بڑی باریکی کے ساتھ جانچتی تھی اور درحقیقت اس طرح کے ملازمین میں سے کسی ملازم کی گمشدگی اس سامراجی حکومت کے لیے تشویشناک تھی جو اسلامی ممالک میں غدر مچانے اور انہیں زیر کرنے کی اسکیموں کی تیاری میں مصروف ہو۔

ہمارا تعلق ایک ایسی قوم سے ہے جو آبادی کے اعتبار سے کم ہونے کے ساتھ بڑی اہم ذمہ داریوں کا بوجھ سہار رہی ہے اور تجربہ کار افراد کی کمی یقیناً ہمارے لیے شدید نقصان کا باعث تھی۔

سیکریٹری نے میری آخری رپورٹ کے اہم حصوں کے مطالعہ کے بعد مجھے اس کانفرنس میں شرکت کی ہدایت کی جس میں لندن بلائے گئے پانچ جاسوسوں کی رپورٹیں سنی جانے والی تھیں۔ اس کانفرنس میں جو وزیر خارجہ کی صدارت میں ہو رہی تھی نوآبادیاتی وزارت کے اعلیٰ عہدہ دار شرکت کر رہے تھے۔ میرے تمام ساتھیوں نے اپنی رپورٹوں کے اہم حصوں کو پڑھ کر سنایا۔ وزیر خارجہ، نوآبادیاتی علاقوں کی وزارت

کے سیکریٹری اور بعض حاضرین نے میری رپورٹ کو بڑا سراہا تاہم میں اس محاسبہ میں تیسرے نمبر پر تھا۔ دو اور جاسوسوں نے مجھ سے بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کیا تھا جن میں پہلا نمبر جی بلکوڈ G. BELCOUD اور دوسرا ہنری فانس HENRY FANSE کا تھا۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ میں نے ترکی، عربی، تجوید قرآن اور اسلامی شریعت میں سب سے زیادہ دسترس حاصل کی تھی لیکن عثمانی حکومت کے زوال کے سلسلے میں میری رپورٹ زیادہ کامیاب نہیں تھی۔ جب سیکریٹری نے کانفرنس کے اختتام پر میری اس کمزوری کا ذکر کیا تو میں نے کہا:

ان دو سالوں میں میرے لیے دو زبانوں کا سیکھنا، تفسیر قرآن اور اسلامی شریعت سے آشنائی زیادہ اہمیت کی حامل تھی اور دوسرے امور پر توجہ دینے کے لیے میرے پاس زیادہ وقت نہیں تھا۔ اگر آپ بھروسا کریں تو میں یہ کسر آئندہ سفر میں پوری کر دوں گا۔

سیکریٹری نے کہا: اس میں کوئی شک نہیں کہ تم اپنے کام میں کامیاب رہے ہو لیکن ہم چاہتے ہیں کہ تم اس راہ میں دوسروں سے بازی لے جاؤ۔

اس نے یہ بھی کہا: آئندہ کے لیے تمھیں دو اہم باتوں کا خیال رکھنا ہے:

۱۔ مسلمانوں کی ان کمزوریوں کی نشاندہی کرو جو ہمیں ان تک

کے سیکریٹری اور بعض حاضرین نے میری رپورٹ کو بڑا سراہا۔ تاہم میں اس محاسبہ میں تیسرے نمبر پہ تھا۔ دو اور جاسوسوں نے مجھ سے بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کیا تھا جن میں پہلا نمبر جی بلکوڈ G. BELCOUD اور دوسرا ہنری فانس HENRY FANSE کا تھا۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ میں نے ترکی، عربی، تجوید قرآن اور اسلامی شریعت میں سب سے زیادہ دسترس حاصل کی تھی لیکن عثمانی حکومت کے زوال کے سلسلے میں میری رپورٹ زیادہ کامیاب نہیں تھی۔ جب سیکریٹری نے کانفرنس کے اختتام پر میری اس کمزوری کا ذکر کیا تو میں نے کہا:

ان دو سالوں میں میرے لیے دو زبانوں کا سیکھنا، تفسیر قرآن اور اسلامی شریعت سے آشنائی زیادہ اہمیت کی حامل تھی اور دوسرے امور پر توجہ دینے کے لیے میرے پاس زیادہ وقت نہیں تھا۔ اگر آپ بھروسا کریں تو میں یہ کسر آئندہ سفر میں پوری کر دوں گا۔

سیکریٹری نے کہا: اس میں کوئی شک نہیں کہ تم اپنے کام میں کامیاب رہے ہو لیکن ہم چاہتے ہیں کہ تم اس راہ میں دوسروں سے بازی لے جاؤ۔

اس نے یہ بھی کہا: آئندہ کے لیے تمہیں دو اہم باتوں کا خیال رکھنا ہے:

۱۔ مسلمانوں کی ان کمزوریوں کی نشاندہی کرو جو ہمیں ان تک

پہنچے اور ان کے مختلف گروہوں کے درمیان پھوٹ ڈالنے میں کامیابی فراہم کرے کیونکہ دشمن پر ہماری کامیابی کا راز ان مسائل کی شناخت پر منحصر ہے۔

۲۔ ان کی کمزوریاں جان لینے کے بعد تمہارا دوسرا کام ان میں پھوٹ ڈالنا ہے۔ اس کام میں پوری قوت صرف کرنے کے بعد تمہیں یہ اطمینان ہو جانا چاہیے کہ تمہارا شمار صفِ اوّل کے انگریز جاسوسوں میں ہونے لگا ہے اور تم اعزازی نشان کے حقدار ہو گئے ہو۔

چھ ماہ لندن میں قیام کے بعد میں نے اپنے چچا کی لڑکی "میری شوی" سے شادی کر لی جو مجھ سے ایک سال بڑی تھی۔ اس وقت میں ۲۲ اور وہ ۲۳ سال کی تھی۔ "میری" ایک درمیانہ درجے کی ذہین لڑکی تھی لیکن بڑے دلکش خدوخال کی مالک تھی۔ میری بیوی کا مجھ سے متوازن سلوک تھا اور میں نے اپنی زندگی کے بہترین دن اس کے ساتھ گزارے۔ شادی کے پہلے سال ہی میری بیوی امید سے تھی اور میں نئے مہمان کا بے چینی سے منتظر تھا لیکن ایسے موقع پر مجھے وزارت خانے سے یہ حتمی حکم موصول ہوا کہ میں وقت ضائع کیے بغیر فوراً عراق پہنچوں جو برسہا برس سے عثمانی خلافت کے زیرِ استحصال تھا۔

ہم میاں بیوی جو اپنے پہلے بچے کے انتظار میں تھے اس حکمنامہ سے بہت آزردہ ہوئے لیکن ملک و ملت سے محبت، احساس جاہ طلبی اور اپنے ساتھیوں سے رقابت، تمام گھریلو آسائشات، جذبات اور

بچے کی محبت پر چھا گئی اور میں نے بغیر تردد کے اس نئی ماموریت کو قبول کر لیا حالانکہ میری بیوی بار بار یہ زور دیتی رہی کہ میں اپنی روانگی کو بچے کی پیدائش تک ملتوی رکھوں۔ جب میں اس سے رخصت ہو رہا تھا تو وہ اور میں دونوں بے تحاشا رو رہے تھے۔ اس پر مجھ سے زیادہ رقت طاری تھی اور وہ کہہ رہی تھی: مجھے بھول نہ جانا، خط ضرور لکھتے رہنا، میں بھی اپنے بچے کے سنہرے مستقبل کے بارے میں تمھیں لکھتی رہوں گی۔ اس کی باتوں نے میرا دل پسیج دیا اور مجھے اس منزل تک پہنچایا کہ میں اپنے سفر کو کچھ عرصے تک ملتوی کر دوں لیکن پھر میں نے اپنے آپ پر قابو پایا اور اس سے رخصت ہو کر نئے احکامات حاصل کرنے کے لیے وزارت خانہ روانہ ہو گیا۔

سمندروں میں چھ ماہ کے طویل سفر کے بعد آخر کار میں بصرہ پہنچا۔ اس شہر میں رہنے والے زیادہ تر دہیں اطراف کے قبائل تھے جن میں ایرانی اور عرب اقوام کے دو اہم بازو شیعہ اور سنی ایک ساتھ زندگی بسر کرتے تھے۔ بصرہ میں عیسائیوں کی تعداد بہت کم تھی۔ اپنی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ میں اہلِ تشیع اور ایرانیوں سے مل رہا تھا۔ یہاں یہ بات نامناسب نہیں ہو گی اگر میں اہل تشیع اور اہل تسنن کے عقائد کے بارے میں مختصر کچھ کہتا چلوں۔ شیعہ حضرات، حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے داماد اور چچا زاد بھائی علی بن ابیطالب (علیہ السلام) کے محب ہیں اور ان کو حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا برحق جانشین سمجھتے ہیں۔ انکا

ایمان ہے کہ حضرت محمد مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے نصِ صریح کے ذریعہ حضرت علیؑ کو اپنا جانشین منتخب فرمایا تھا اور آپ کے گیارہ فرزند یکے بعد دیگرے امام اور رسول خداؐ کے برحق جانشین ہیں۔

میری سوچ کے مطابق حضرت علیؑ اور آپ کے دو فرزند امام حسنؑ اور امام حسینؑ کی خلافت کے بارے میں شیعہ حضرات مکمل طور پر حق بجانب ہیں کیونکہ اپنے مطالعات کی بنیاد پر بعض شواہد و اسناد میرے اس دعوے پر دلالت کرتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت علیؑ ہی وہ ہستی تھے جو ممتاز صفات کے حامل تھے اور صحیح طور پر فوج اور اسلامی حکومت کی سربراہی کے اہل تھے۔ امام حسنؑ اور امام حسینؑ کی امامت کے بارے میں حضرت محمدؐ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بہت سی حدیثیں دستیاب ہیں اور اہلسنت کو بھی ان سے انکار نہیں ہے اور دونوں فریق اس پر متحد ہیں[1]۔ البتہ مجھے باقی نو افراد کی جانشینی میں تردد ہے جو حسینؑ بن علیؑ کی اولاد ہیں اور شیعہ حضرات انھیں امام برحق مانتے ہیں[2]۔

---

[1] حضرت علیؑ، جناب حسنینؑ اور دیگر ائمہؑ کی امامت کے بارے میں کثرت سے احادیث نقل ہوئی ہیں۔ ملاحظہ فرمایئے: کتاب توحید از شیخ صدوق۔

[2] اس انگریز جاسوس کا شبہ بے بنیاد ہے اس لیے کہ اولاد امام حسینؑ کی امامت اور حضرت حجتؑ کی غیبت کے بارے میں بہت سی احادیث موجود ہیں۔ ملاحظہ فرمایئے: کتاب توحید از شیخ صدوق۔ منتہی الآمال از شیخ عباس قمی وغیرہ۔

یہ کیسے ممکن ہے کہ پیغمبرؐ ان افراد کی امامت کی خبر دیں جو ابھی پیدا ہی نہ ہوئے ہوں؟ اگر محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اللہ کے برحق پیغمبر ہوں تو غیب کی خبر دے سکتے ہیں جیسا کہ حضرت عیسیٰؑ نے آئندہ کی خبریں دی ہیں لیکن حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نبوت عیسائیوں کے نزدیک مسلّم نہیں ہے۔[1]

مسلمانوں کا کہنا ہے کہ قرآنؔ پیغمبرؐ کی نبوت پر بھرپور دلیل ہے لیکن میں نے جتنا بھی قرآن پڑھا مجھے ایسی کوئی دلیل نہیں ملی۔[2]

---

[1] ایک انگریز جاسوس سے اس طرح کے نظریات خلافِ توقع نہیں ہیں خاص طور پر جب اسے مسلمانوں کی سرکوبی کے لیے بھیجا گیا ہو۔

[2] یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ ایک قاریِ قرآن کی نظر اس آیت پر نہ گئی ہو جس میں حضرت عیسیٰؑ بنی اسرائیل کو جناب ختمی مرتبتؐ کی بعثت کی خبر دیتے ہیں؟

وَمُبَشِّرًا بِرَسُولٍ يَأْتِي مِنْ بَعْدِي اسْمُهُ أَحْمَدُ (سورۂ صف آیت ۶)

اس کے علاوہ جناب رسالتمآبؐ کی رسالت پر صریحاً چار آیتیں موجود ہیں۔

(۱) وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ (سورۂ آل عمران آیت ۱۴۴)

(۲) مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِنْ رِجَالِكُمْ وَلَٰكِنْ رَسُولَ اللَّهِ (سورۂ احزاب آیت ۴۰)

(۳) وَآمَنُوا بِمَا نُزِّلَ عَلَىٰ مُحَمَّدٍ وَهُوَ الْحَقُّ مِنْ رَبِّهِمْ (سورۂ محمد آیت ۲)

(۴) مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللَّهِ ۚ وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ ۔ (سورۂ فتح آیت ۲۹)

اس میں کوئی شک نہیں کہ قرآن ایک بلند پایہ کتاب ہے اور اس کا مقام تورات اور انجیل سے بڑھ کر ہے۔ قدیم داستانیں، اسلامی احکام آداب، تعلیمات اور دیگر باتوں نے اس کتاب کو زیادہ معتبر اور زیادہ ممتاز بنا دیا ہے لیکن کیا صرف یہ خصوصی فوقیت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی سچائی پر دلیل بن سکتی ہے؟ میں حیران ہوں کہ ایک صحرا نشین جسے لکھنا اور پڑھنا بھی نہ آتا ہو کس طرح ایک ایسی ارفع و اعلیٰ کتاب انسانیت کے حوالے کر سکتا ہے۔ یہ کام تو کوئی پڑھا لکھا اور صاحبِ استعداد آدمی بھی اپنی پوری ہوشمندی کے باوجود انجام نہیں دے سکتا۔ پھر کس طرح ایک صحرائی عرب بغیر تعلیم کے ایک ایسی کتاب لکھ سکتا ہے؟ اور جیسا کہ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں: "کیا یہ کتاب پیغمبر کی نبوّت پر دلیل ہو سکتی ہے؟"

میں نے اس بارے میں حقیقت سے آگاہی کے لیے بہت مطالعہ کیا ہے۔ لندن میں جب میں نے ایک پادری کے سامنے اس موضوع کو پیش کیا تو وہ بھی کوئی قابلِ اطمینان جواب نہ دے سکا۔ ترکی میں بھی میں نے شیخ احمد سے کئی دفعہ اس موضوع پر بات چیت کی مگر وہاں بھی مجھے اطمینان نہیں ہوا۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ میں لندن کے پادری کے مقابل، شیخ احمد سے اتنی کھل کر گفتگو نہیں کر سکتا تھا اس لیے کہ مجھے خطرہ تھا کہ کہیں میرا پول نہ کھل جائے یا پھر کم از کم پیغمبر اسلامؐ کے بارے میں اسے میری نیت پر شک نہ ہو جائے۔ بہرحال میں حضرت محمدؐ کی قدر و منزلت

کی عظمت اور بزرگی کا قائل ہوں۔ بے شک آپ کا شمار ان با فضیلت افراد میں ہوتا ہے جن کی کوششیں تربیت بشر کے لیے ناقابلِ انکار ہیں اور تاریخ اس بات پر شاہد ہے لیکن پھر بھی مجھے ان کی رسالت میں شک ہے۔ تاہم اگر انھیں پیغمبر تسلیم نہ بھی کیا جائے تو بھی ان کی بزرگی ان افراد سے بڑھ کر ہے جنھیں ہم نوابغ سمجھتے ہیں۔ محمدؐ تاریخ کے ہوشمند ترین افراد سے زیادہ ہوشمند تھے۔

اہل سنت کہتے ہیں: حضرات ابوبکر، عمر اور عثمان سلیم آراء کی بنیاد پر حضرت علیؑ سے زیادہ امرِ خلافت کے حقدار تھے۔ اس طرح انہوں نے خلفاء کے انتخاب میں قول پیغمبرؐ کو بھلا کر براہِ راست اقدام کیا۔ اس طرح کے اختلافات اکثر ادیان، بالخصوص عیسائیت میں پائے جاتے ہیں لیکن شیعہ سنی اختلاف کا ناقابلِ فہم پہلو اس کا استقرار یا مسلسل جاری رہنا ہے جو حضرت علیؑ اور حضرت عمر کے گزرنے کے صدیوں بعد بھی اب تک اسی زور و شور سے باقی ہے۔ اگر مسلمان حقیقتاً عقل سے کام لیتے تو گزری تاریخ اور بھولے زمانے کے بجائے آج کے بارے میں سوچتے۔ ایک دفعہ میں نے شیعہ سنی اختلاف کے موضوع کو اپنی نوآبادیاتی علاقوں کی وزارت کے سامنے پیش کیا اور ان سے کہا:

"مسلمان اگر زندگی کے صحیح مفہوم کو سمجھتے تو ان اختلافات کو چھوڑ بیٹھتے اور وحدت و اتحاد کی بات کرتے"

اچانک صدر جلسہ نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا:

"تمھارا کام مسلمانوں کے درمیان اختلاف کی آگ بھڑکانا ہے نہ یہ کہ تم انھیں اتحاد اور یک جہتی کی دعوت دو"

عراق جانے سے پہلے سیکرٹری نے اپنی ایک نشست میں مجھ سے کہا:

ہمفرے! تم جانتے ہو کہ جنگ اور جھگڑے انسان کے لیے ایک فطری امر ہیں اور جب سے خدا نے آدمؑ کو خلق کیا اور اس کے صلب سے ہابیل اور قابیل پیدا ہوئے اختلاف نے سر اٹھایا اور اب اس کو حضرت عیسیٰؑ کی بازگشت تک اسی طرح جاری رہنا ہے۔

ہم انسانی اختلافات کو پانچ باتوں پر تقسیم کر سکتے ہیں:

۱۔ نسلی اختلافات
۲۔ قبائلی اختلافات
۳۔ ارضی اختلافات
۴۔ قومی اختلافات
۵۔ مذہبی اختلافات

اس سفر میں تمہارا اہم ترین فریضہ مسلمانوں کے درمیان اختلافات کے مختلف پہلوؤں کو سمجھنا اور انھیں ہوا دینے کے طریقوں کو سیکھنا ہے۔ اس سلسلے میں جتنی بھی معلومات مہیا ہو سکیں تمھیں

اس کی اطلاع لندن کے حکام تک پہنچانا ہے۔ اگر تم اسلامی ممالک کے بعض حصوں میں سنی شیعہ فساد برپا کر دو تو گویا تم نے حکومت برطانیہ کی عظیم خدمت کی ہے۔

جب تک ہم اپنے نو آبادیاتی علاقوں میں نفاق، تفرقہ، شورش اور اختلاف کی آگ کو ہوا نہیں دیں گے پرسکون اور مرفہ الحال نہیں ہو سکتے۔ ہم اس وقت تک عثمانی سلطنت کو شکست نہیں دے سکتے جب تک اس کے قلمرو میں شہر شہر، گلی گلی فتنہ و فساد برپا نہ کر دیں۔ اتنے بڑے علاقہ پر انگریزوں کی مختصر سی قوم سوائے اس ہتھکنڈے کے اور کس طرح چھا سکتی ہے۔

پس اے ہمفرے تمہیں چاہیے کہ تم پہلے اپنی پوری قوت صرف کر کے ہنگامے، شور شرابے، پھوٹ اور اختلافات کی کوئی راہ نکالو اور پھر وہاں سے اپنے کام کا آغاز کرو۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اس وقت عثمانی اور ایرانی حکومتیں کمزور ہو چکی ہیں۔ تمہارا فرض ہے کہ تم لوگوں کو ان کے حکمرانوں کے خلاف بھڑکاؤ۔ تاریخی حقائق کی بنیاد پر ہمیشہ انقلابات، حکمرانوں کے خلاف عوام کی شورش سے وجود میں آئے ہیں۔ جب کبھی کسی علاقے کے عوام میں پھوٹ اور انتشار پڑ جائے تو استعمار کی راہ بڑی آسانی سے ہموار ہو سکتی ہے۔

۷

بصرہ پہنچ کر میں ایک مسجد میں داخل ہوا مسجد کے پیش امام اہلسنت کے مشہور عالم شیخ عمر طائی تھے۔ میں نے انھیں دیکھ کر بڑے ادب سے سلام کیا لیکن شیخ ابتدائی لمحہ سے ہی مجھ پر مظنون ہوا اور میرے حسب نسب اور گزشتہ زندگی کے بارے میں مجھ سے سوالات کرنے لگا۔ میرا خیال ہے کہ میرے چہرے اور لہجہ نے اسے شک میں ڈال دیا تھا لیکن میں نے بڑی ترکیب سے اپنے آپ کو اس کی گرفت سے بچا لیا اور شیخ کے جواب میں کہا:

> میں ترکی میں واقع "آغدیر" کا رہنے والا ہوں اور مجھے قسطنطنیہ کے شیخ احمد کی شاگردی کا شرف حاصل ہے میں نے وہاں خالد بڑھئی کے پاس بھی کام کیا ہے۔

مختصر یہ کہ ترکی میں جو کچھ میں نے سیکھا تھا وہ سب اس سے بیان کیا۔

میں نے دیکھا کہ شیخ حاضرین میں سے کسی کو آنکھ کے ذریعے اشارہ کر رہا ہے۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ جاننا چاہتا ہے کہ مجھے ترکی آتی بھی ہے کہ نہیں۔ اس شخص نے آنکھوں سے حامی بھری۔ میں دل میں بہت خوش ہوا کہ میں نے کسی حد تک شیخ کا دل جیت لیا ہے لیکن کچھ ہی دیر بعد مجھے اپنی غلط فہمی کا احساس ہوا اور میں نے محسوس کیا کہ شیخ کا شبہ ابھی اپنی جگہ باقی ہے اور وہ مجھے عثمانیوں کا جاسوس سمجھتا ہے۔ مشہور تھا کہ شیخ، بصرہ کے گورنر کا سخت مخالف تھا جسے عثمانیوں نے متعین کیا تھا۔

بہرحال میرے پاس اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں تھا کہ میں شیخ عمر کی مسجد سے علاقے کے ایک غریب نواز مسافر خانہ میں منتقل ہو جاؤں۔ میں نے وہاں ایک کمرہ کرایہ پر لیا۔ مسافر خانہ کا مالک ایک احمق آدمی تھا جو ہر صبح سویرے مسافروں کو پریشان کیا کرتا تھا۔ اذان کے بعد اندھیرے منہ میرا دروازہ زور زور سے پیٹتا تھا اور مجھے نماز کے لیے جگاتا تھا اور پھر سورج نکلنے تک قرآن پڑھنے پر مجبور کرتا تھا۔ جب میں اس سے کہتا کہ قرآن پڑھنا واجب نہیں ہے پھر کیوں تمہیں اس امر میں اتنا اصرار ہے؟ تو وہ کہتا کہ طلوع آفتاب سے قبل کی نیند فقر اور بدبختی لاتی ہے اور اس طرح اس مسافر خانہ کے تمام مسافر بدبختی کا شکار ہو جائیں گے۔ مجھے اس کی بات ماننی پڑی کیونکہ وہ مجھے وہاں سے نکل جانے کی دھمکی دیتا تھا۔ ہر روز صبح میں نماز کے لیے اٹھتا تھا اور پھر ایک گھنٹہ یا اس سے بھی زیادہ وقت تک قرآن کی تلاوت کرتا تھا۔

میری مشکل یہیں ختم نہیں ہوئی۔ ایک دن مسافر خانے کے مالک مرشد آفندی نے آکر کہا: جب سے تم نے اس مسافر خانے میں رہائش اختیار کی ہے مصیبتوں نے میرا گھر دیکھ لیا ہے اور اس کی وجہ تم اور تمہاری لائی ہوئی نحوست ہے اس لیے کہ تم نے ابھی تک شادی نہیں کی ہے اور کسی کو اپنا شریک حیات نہیں بنایا ہے۔ تمھیں یا شادی کرنی ہوگی یا پھر یہاں سے جانا ہوگا۔

میں نے کہا: آفندی! میں شادی کے لیے سرمایہ کہاں سے لاؤں؟ اس دفعہ میں نے اپنے آپ کو شادی کے ناقابل ظاہر کرنے سے احتراز کیا کیونکہ میں جانتا تھا کہ مرشد آفندی لٹھ لگائے بغیر میری بات پر یقین کرنے والا آدمی نہیں تھا۔

مرشد آفندی نے جواب دیا: او نام کے ضعیف الاعتقاد مسلمان! کیا تم نے قرآن کا مطالعہ نہیں کیا ہے جہاں وہ فرماتا ہے:

"وہ لوگ جو فقر میں مبتلا ہیں خداوند عالم انھیں اپنی بزرگی سے مالا مال کردے گا"

میں حیران تھا کہ اس ناسمجھ انسان سے کس طرح پیچھا چھڑاؤں۔ آخر کار میں نے اس سے کہا: آپ کا ارشاد بجا ہے لیکن میں رقم کے بغیر کیسے شادی کر سکتا ہوں؟ کیا آپ ضروری اخراجات کے لیے مجھے کچھ رقم قرض دے سکتے ہیں؟ اسلام میں مہر ادا کیے بغیر کوئی عورت کسی کے عقد میں نہیں آسکتی۔

آفندی کچھ دیر سوچ میں پڑ گیا اور پھر قرض الحسنہ کی بات کرنے کے بجائے اچانک اس نے سر بلند کیا اور اونچی آواز میں چیخا: مجھے کچھ نہیں معلوم یا تمہیں شادی کرنی ہوگی یا پھر رجب کی پہلی تاریخ تک یہ چھوڑنا ہوگا۔

اس دن جمادی الثانی کی پانچویں تاریخ تھی اور صرف ۲۵ دن میرے پاس تھے۔

اسلامی مہینوں کے ناموں کے بارے میں بھی یہاں کچھ تذکرہ نامناسب نہ ہوگا:

۱۔ محرم	۲۔ صفر
۳۔ ربیع الاوّل	۴۔ ربیع الثانی
۵۔ جمادی الاوّل	۶۔ جمادی الثانی
۷۔ رجب	۸۔ شعبان
۹۔ رمضان	۱۰۔ شوال
۱۱۔ ذوالقعدہ	۱۲ ذوالحجہ

ہر مہینہ چاند کے آغاز سے شروع ہوتا ہے اور ۳۰ دن سے اوپر نہیں جاتا لیکن کبھی کبھی چاند ۲۹ دن کا بھی ہوتا ہے۔

مختصر یہ کہ مسافر خانہ کے مالک کی سخت گیری کے سبب مجھے وہ جگہ چھوڑنا پڑی۔ میں نے یہاں بھی ایک ترکھان کی دکان پر اس شرط کے ساتھ نوکری کر لی کہ وہ مجھے رہنے اور کھانے کی سہولت فراہم کریگا

اور اس کے عوض مزدوری کم دے گا۔ میں رجب سے پہلے ہی نئی جگہ منتقل ہو گیا اور ترکھان کی دکان پر پہنچا۔ ترکھان عبدالرضا نہایت شریف اور محترم شخص تھا اور مجھ سے اپنے بیٹوں جیسا سلوک کرتا تھا۔

عبدالرضا ایرانی الاصل شیعہ تھا اور خراسان کا رہنے والا تھا۔ میں نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس سے فارسی سیکھنا شروع کی۔ دوپہر کے وقت اس کے پاس بصرہ میں مقیم ایرانی جمع ہوتے تھے جو سب کے سب شیعہ تھے۔ وہاں بیٹھ کر ادھر ادھر کی گفتگو ہوتی تھی۔ کبھی سیاست اور معیشت عنوان کلام ہوتا اور کبھی عثمانی حکومت کو برا بھلا کہا جاتا۔ خاص طور پر سلطنت وقت اور استنبول میں مقرر ہونے والا خلیفۂ مسلمین ان کی تنقید کا نشانہ ہوتا لیکن جونہی کوئی اجنبی گاہک دکان میں آتا وہ سب کے سب خاموش ہو جاتے اور ذاتی دلچسپی کے متعلق غیر اہم باتیں ہونے لگتیں۔

مجھے معلوم نہیں میں کیونکر ان کے لیے قابل اعتماد تھا اور وہ میرے سامنے ہر قسم کی گفتگو کو جائز سمجھتے تھے۔ یہ بات مجھے بعد میں معلوم ہوئی کہ انھوں نے مجھے آذربائیجان کا رہنے والا خیال کیا تھا کیونکہ میں ترکی میں بات چیت کرتا تھا اور آذربائیجانیوں کی طرح میرا چہرہ سرخ و سفید تھا۔

ان دنوں جب میں ترکھان کا کام کرتا تھا میری ملاقات ایک

ایسے شخص سے ہوئی جو وہاں آتا جاتا رہتا تھا اور ترکی، فارسی اور عربی زبانوں میں گفتگو کرتا تھا۔ وہ دینی طالب علموں کا لباس پہنتا تھا۔ اس کا نام محمد بن عبدالوہاب تھا۔ وہ ایک اونچا اڑنے والا، ایک جاہ طلب اور نہایت غصیلا انسان تھا۔ اسے عثمانی حکومت سے سخت نفرت تھی اور وہ ہمیشہ اس کی برائی کرتا تھا لیکن حکومت ایران سے اس کو کوئی سروکار نہیں تھا۔ ترکھان عبدالرضا سے اس کی دوستی کی وجہ مشترک یہ تھی کہ وہ دونوں ہی عثمانی خلیفہ کو اپنا سخت ترین دشمن سمجھتے تھے لیکن میرے علم میں یہ بات نہ آسکی کہ اس نے عبدالرضا ترکھان سے کس طرح دوستی بڑھائی تھی جبکہ یہ سنی اور وہ شیعہ تھا۔ مجھے یہ بھی نہیں معلوم ہو سکا کہ اس نے فارسی کہاں سے سیکھی تھی؟ البتہ بصرہ میں شیعہ سنی مسلمان ایک ساتھ زندگی بسر کرتے تھے اور ایک دوسرے کے ساتھ ان کے روابط بھی دوستانہ تھے اور وہاں فارسی اور عربی دونوں زبانیں بولی جاتی تھیں تاہم ترکی سمجھنے والوں کی تعداد بھی وہاں کچھ کم نہ تھی۔

محمد عبدالوہاب ایک آزاد خیال آدمی تھا۔ اس کا ذہن شیعہ سنی تعصبات سے بالکل پاک تھا حالانکہ وہاں کے بیشتر سنی حضرات شیعوں کے خلاف تھے اور بعض سنی مفتی شیعوں کی تکفیر بھی کرتے تھے۔ شیخ محمد کے نزدیک حنفی، شافعی، حنبلی اور مالکی مکاتیبِ فکر میں سے کسی مکتبِ فکر کی کوئی خاص اہمیت نہیں تھی۔ وہ کہتا تھا کہ خدا نے جو کچھ قرآن میں کہہ دیا ہے بس وہی ہمارے لیے کافی ہے۔

ان چار مکاتیب فکر کی داستان بھی کچھ یوں ہے کہ حضرت پیغمبر اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی وفات کے سو سال بعد عالم اسلام میں بلند پایہ علماء کا ظہور عمل میں آیا جن میں سے چار افراد ابو حنیفہؒ، احمد بن حنبلؒ، مالک بن انسؒ اور محمد بن ادریس شافعی اہل سنت کی پیشوائی کے مقام تک پہنچے۔ عباسی خلفاء کا زمانہ تھا اور ان عباسی خلفاء نے مسلمانوں پر دباؤ ڈال رکھا تھا کہ وہ مذکورہ چار افراد کے علاوہ کسی کی تقلید نہ کریں اگرچہ کوئی قرآن وسنت میں ان سے بڑھ کر دسترس کیوں نہ رکھتا ہو۔ عباسی خلفاء نے ان کے علاوہ کسی متبحر اور اعلیٰ پایہ عالم کو ان کے مقابل میں ابھرنے نہیں دیا اور اس طرح درحقیقت انھوں نے علم کے دروازے کو بند کر دیا اور یہ بات اہل سنت والجماعت کے فکری جمود کا باعث بنی۔ اس کے برعکس شیعہ حضرات نے اہلسنت کی اس پابندی اور جمودی کیفیت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے عقائد و نظریات کو وسیع پیمانے پر منتشر کرنا شروع کیا اور دوسری صدی ہجری کے آغاز میں باوجود اس کے کہ شیعہ آبادی اہل سنت کے مقابل میں دس فیصد تھی ان کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہونے لگا اور وہ اہل سنت کے ہم پایہ ہو گئے اور یہ ایک فطری امر تھا کیونکہ شیعہ حضرات کے پاس اجتہاد کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور یہ بات مسلمانوں کی تازگی فکر، اسلامی فقہ کی پیشرفت اور نئی روشنی میں قرآن وسنت کے فہم کا باعث بنی اور اسی نے اسلام کو نئے زمانوں کے تقاضوں سے ہم آہنگ کیا۔ اجتہاد

ہی وہ بڑا وسیلہ تھا جو فکری جمود سے نبرد آزما رہا اور اس کے ذریعے اسلام نے جلا پائی اور فکروں میں انقلاب رونما ہوا۔ اسلام کو چار مکاتیب فکر میں مقید کرنا، مسلمانوں کے لیے جستجو اور تلاش کے راستوں کو بند کرنا اور نئی بات سے ان کی سماعت کو روکنا اور وقت کے تقاضوں سے انھیں بے توجہ رکھنا در اصل وہ پوشیدہ اسلحہ تھا جس نے مسلمانوں کی پیشرفت روک دی۔ ظاہر ہے کہ جب دشمن کے ہاتھ میں نیا اسلحہ ہو اور آپ اپنے پرانے زنگ زدہ اسلحہ سے اس کا مقابلہ کرینگے تو یقیناً جلد یا بدیر آپ کو ہزیمت اٹھانا پڑے گی۔ میں پیشین گوئی سے کام لیتے ہوئے یہ کہوں گا کہ اہل سنت کے صاحبانِ عقل افراد بہت جلد ہی مسلمانوں پر اجتہاد کا دروازہ کھول دیں گے اور یہ کام میرے اندازے کے مطابق اگلی صدی تک روبہ عمل آئے گی اور سو سال بعد مسلمانوں میں اجتہاد کے حامی شیعوں کی اکثریت ہو گی اور اہل تسنن اقلیت میں رہ جائیں گے۔

اب میں شیخ محمد عبدالوہاب کے بارے میں عرض کروں کہ یہ شخص قرآن و حدیث کا اچھا مطالعہ رکھتا تھا اور اپنے افکار کی حمایت میں بزرگان اسلام کے اقوال و آراء کو بطور سند پیش کرتا تھا لیکن کبھی کبھی اس کی فکر مشاہیر علماء کے خلاف ہوتی تھی۔ وہ بات بات پہ کہتا:

پیغمبر خدا (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے صرف کتاب اور سنت کو ناقابل تغیر اصول بنا کر ہمارے لیے پیش کیا اور کبھی یہ

نہیں کہا کہ صحابۂ کرام اور ائمۂ دین کے فرمودات اٹل اور وحیِ منزل ہیں۔ پس ہم پر واجب ہے کہ ہم صرف کتاب و سنت کی پیروی کریں۔ علماء، ائمۂ اربعہ حتیٰ کہ صحابہ کی رائے خواہ کچھ بھی کیوں نہ ہو ہمیں ان کے اتفاق و اختلاف پر اپنے دین کو استوار نہیں کرنا چاہیے۔

ایک دن اس کی ایران سے آنے والے ایک عالم سے کھانے کے دسترخوان پر جھڑپ ہو گئی۔ اس عالم کا نام شیخ جواد قمیؔ تھا اور اسے عبدالرضا ترکھان نے اپنے پاس مہمان بلایا تھا۔ شیخ جواد قمیؔ کے محمد بن عبدالوہاب سے اصولی اختلافات تھے اور ان کی گفتگو نے جلد ہی تلخی اور ترشی کا رنگ اختیار کر لیا۔

مجھے ان کے درمیان ہونے والی تمام گفتگو تو یاد نہیں البتہ جو حصے مجھے یاد ہیں میں ان کو یہاں پیش کرنا چاہتا ہوں۔

شیخ قمیؔ نے ان جملوں سے اپنی گفتگو کا آغاز کیا اور محمد بن عبدالوہاب سے کہا:

"اگر تم ایک آزاد خیال انسان ہو اور اپنے دعوے کے مطابق اسلام کا کافی مطالعہ کر چکے ہو تو پھر کیا وجہ ہے کہ تم حضرت علیؑ کو وہ فضیلت نہیں دیتے جو شیعہ دیتے ہیں؟"

محمد نے جواب دیا: اس لیے کہ حضرت عمرؓ اور دیگر افراد کی طرح ان کی باتیں بھی میرے لیے حجّت نہیں ہیں۔ میں صرف کتاب و سنت

کو مانتا ہوں۔

قمی: اچھا اگر تم سنت کے عامل ہو تو کیا پیغمبر اکرمؐ نے یہ نہیں کہا تھا: "میں شہر علم ہوں اور علیؑ اس کا دروازہ ہیں[1]" اور کیا یہ کہہ کر پیغمبرؐ نے علیؑ اور صحابہ کے درمیان فرق قائم نہیں کیا؟

محمد: اگر ایسا ہی ہے تو پھر پیغمبرؐ کو یہ کہنا چاہیے تھا کہ "میں تمہارے درمیان دو چیزیں چھوڑے جاتا ہوں ایک کتاب اور ایک علیؑ بن ابیطالبؑ۔

قمی: بے شک یہ بات بھی پیغمبرؐ نے اپنے مقام پر کہی ہے کہ: "میں نے تمہارے درمیان کتاب اور اہلبیتؑ کو چھوڑا ہے[2]" بے شک علیؑ اہلبیتؑ کے سربرآوردہ افراد میں سے ہیں۔

محمد نے اس حدیث کو جھٹلایا لیکن شیخ قمی نے اصول کافی کے اسناد کی بنیاد پر پیغمبرؐ سے اس حدیث کو ثابت کیا اور محمد کو خاموش ہونا پڑا۔ اب اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ اچانک اس نے شیخ پر اعتراض ٹھونکا: "پیغمبرؐ نے ہمارے لیے صرف کتاب اور اپنے اہلبیتؑ کو باقی رکھا ہے تو پھر سنت کہاں گئی؟

قمی نے جواب دیا: سنت اسی کتاب کی تفسیر و تشریح کا نام ہے

---

[1] اَنَا مَدِیْنَۃُ الْعِلْمِ وَعَلِیٌّ بَابُھَا۔

[2] اِنِّیْ تَارِکٌ فِیْکُمُ الثَّقَلَیْنِ کِتَابَ اللّٰہِ وَعِتْرَتِیْ اَھْلَ بَیْتِیْ۔

کو مانتا ہوں۔

قمی: اچھا اگر تم سنت کے عامل ہو تو کیا پیغمبر اکرمؐ نے یہ نہیں کہا تھا: "میں شہر علم ہوں اور علیؑ اس کا دروازہ ہیں[1]" اور کیا یہ کہہ کر پیغمبرؐ نے علیؑ اور صحابہ کے درمیان فرق قائم نہیں کیا؟

محمد: اگر ایسا ہی ہے تو پھر پیغمبرؐ کو یہ کہنا چاہیے تھا کہ "میں تمہارے درمیان دو چیزیں چھوڑے جاتا ہوں ایک کتاب اور ایک علیؑ بن ابیطالبؑ۔

قمی: بے شک یہ بات بھی پیغمبرؐ نے اپنے مقام پر کہی ہے کہ: "میں نے تمہارے درمیان کتاب اور اہلبیتؑ کو چھوڑا ہے[2]" بے شک علیؑ اہلبیتؑ کے سربرآوردہ افراد میں سے ہیں۔

محمد نے اس حدیث کو جھٹلایا لیکن شیخ قمی نے اصول کافی کے اسناد کی بنیاد پر پیغمبرؐ سے اس حدیث کو ثابت کیا اور محمد کو خاموش ہونا پڑا۔ اب اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ اچانک اس نے شیخ پر اعتراض ٹھونکا: "پیغمبرؐ نے ہمارے لیے صرف کتاب اور اپنے اہلبیتؑ کو باقی رکھا ہے تو پھر سنت کہاں گئی؟

قمی نے جواب دیا: سنت اسی کتاب کی تفسیر و تشریح کا نام ہے

---

[1] أَنَا مَدِينَةُ الْعِلْمِ وَعَلِيٌّ بَابُهَا۔

[2] إِنِّي تَارِكٌ فِيكُمُ الثَّقَلَيْنِ كِتَابَ اللهِ وَعِتْرَتِي أَهْلَ بَيْتِي۔

اور اس کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔ پیغمبر خدا (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا ہے اللہ کی کتاب اور میرے اہلبیتؑ یعنی کتاب خدا اس تشریح و تفسیر کے ساتھ جو سنت کہلاتی ہے اور اس کے بعد سنت کی تکرار کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

محمد نے کہا: اگر آپکے دعوے کے مطابق عترت یا اہلِ بیتؑ ہی کلام الٰہی کی تفسیر ہیں تو پھر کیوں متن حدیث میں اس کا اضافہ ہوا ہے؟

قمی نے جواب دیا: "جناب رسالتمآب (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی وفات کے بعد امتِ محمدی کو قرآن سمجھانے والے کی اشد ضرورت تھی کیونکہ قوم اپنی زندگی کو احکام الٰہی پر منطبق کرنا چاہتی تھی اس لیے پیغمبر اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنے غیبی علم کی بنیاد پر کتابِ الٰہی کو اصل ثابت اور عترت کو مفسر و شارح کتاب بنا کر امت کے حوالے کیا۔

حیرانی کے ساتھ ساتھ مجھے ان کی گفتگو سے بڑا مزا آرہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ محمد بن عبدالوہاب اس ضعیف العمر شیخ جواد قمیؒ کے آگے ایک ایسی چڑیا کی مانند پھڑپھڑا رہا تھا جسے قفس میں بند کر دیا گیا ہو اور اس کے پرواز کی راہ مسدود ہو گئی ہو۔

محمد بن عبدالوہاب سے میل جول اور ملاقاتوں کے ایک سلسلہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ برطانوی حکومت کے مقاصد کو عملی جامہ پہنانے کے لیے یہ شخص بہت مناسب دکھائی دیتا ہے۔ اس کی

اونچا اڑنے کی خواہش، جاہ طلبی، غرور، علماء و مشائخ اسلام سے اس کی دشمنی، اس حد تک خودسری کہ خلفاءِ راشدین بھی اس کی تنقید کا نشانہ بنیں اور حقیقت کے سراسر خلاف قرآن و حدیث سے استفادہ اس کی کمزوریاں تھیں جس سے بڑی آسانی سے فائدہ اٹھایا جا سکتا تھا۔

میں نے سوچا کہاں یہ مغرور نوجوان اور کہاں استنبول کا وہ ترک بوڑھا آدمی (احمد آفندی) جس کے افکار و کردار گویا ہزار سال پہلے کے افراد کی تصویر کشی کرتے تھے۔ اس نے اپنے اندر ذرا بھی تبدیلی پیدا نہیں کی تھی۔ حنفی مذہب سے تعلق رکھنے والا وہ بوڑھا شخص ابو حنیفہ کا نام زبان پر لانے سے پہلے اٹھ کر وضو کرتا تھا یا مثلاً صحیح بخاری کے مطالعہ کو اپنا فرض سمجھتا تھا جو اہل سنت کے نزدیک حدیثوں کی نہایت معتبر اور مستند کتاب ہے اور وہاں بھی وہ وضو کے بغیر کتاب کو نہیں چھوتا تھا اور اس کے بالکل برعکس شیخ محمد بن عبدالوہاب ابو حنیفہ کی تحقیر کرتا تھا اور اسے ناقابلِ اعتبار سمجھتا تھا۔ محمد کہتا تھا: "میں ابو حنیفہ سے زیادہ جانتا ہوں" اس کا دعویٰ تھا کہ نصف صحیح بخاری بالکل لچر اور بیہودہ ہے۔

بہرصورت میں نے محمد سے بہت گہرے مراسم قائم کر لیے اور ہماری دوستی میں ناقابلِ جدائی استحکام پیدا ہو گیا۔ میں بار بار اس کے کانوں میں یہ رس گھولتا تھا کہ خدا نے تمہیں حضرت علیؑ اور حضرت عمر سے کہیں زیادہ صاحبِ استعداد بنایا ہے اور تمہیں بڑی فضیلت

اور بزرگی بخشی ہے۔ اگر تم جناب رسالتمآبؐ کے زمانے میں ہوتے تو یقیناً ان کی جانشینی کا شرف تمہیں ہی ملتا۔ میں ہمیشہ پرامید لہجے میں اس سے کہتا:

"میں چاہتا ہوں کہ اسلام میں جس انقلاب کو رونما ہونا ہے وہ تمہارے ہی مبارک ہاتھوں سے انجام پذیر ہو اس لیے کہ صرف تم ہی وہ شخصیت ہو جو اسلام کو زوال سے بچا سکتے ہو اور اس سلسلے میں سب کی امیدیں تم سے وابستہ ہیں۔"

میں نے محمد کے ساتھ طے کیا کہ ہم دونوں بیٹھ کر علماء، مفسرین، پیشوایان دین و مذہب اور صحابۂ کرام سے ہٹ کر نئے افکار کی بنیاد پر قرآن مجید پر گفتگو کریں۔ ہم قرآن پڑھتے اور آیات کے بارے میں اظہار خیال کرتے۔ میرا لائحہ عمل یہ تھا کہ میں کسی طرح اسے انگریز نوآبادیاتی علاقوں کی وزارت کے دام میں پھنسا دوں۔

میں نے آہستہ آہستہ اس اونچی اڑان والے خود پرست انسان کو اپنی گفتگو کی لپیٹ میں لینا شروع کیا یہاں تک کہ اس نے حقیقت سے کچھ زیادہ ہی آزاد خیال بننے کی کوشش کی۔

ایک دن میں نے اس سے پوچھا: "کیا جہاد واجب ہے؟"

اس نے کہا: کیوں نہیں۔ خداوند عالم فرماتا ہے: "کافروں سے جنگ کرو۔"

میں نے کہا: خداوند عالم فرماتا ہے: کافروں اور منافقوں دونوں سے جنگ کرو اور اگر کافروں اور منافقوں سے جنگ واجب ہے تو پھر پیغمبر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم) نے منافقوں سے کیوں جنگ نہیں کی؟"

محمد نے جواب دیا: "جہاد صرف میدان جنگ ہی میں نہیں ہوتا۔ پیغمبر خداؐ نے اپنی رفتار و گفتار کے ذریعے منافقوں سے جنگ کی ہے۔"

میں نے کہا: "پھر اس صورت میں کفار کے ساتھ جنگ بھی رفتار و گفتار کے ساتھ واجب ہے۔"

اس نے جواب دیا: "نہیں، اس لیے کہ پیغمبرؐ نے جنگ کے میدان میں ان کے ساتھ جہاد کیا ہے۔"

میں نے کہا: "کفار کے ساتھ رسولِ خدا (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی جنگ اپنے دفاع کے لیے تھی کیونکہ وہ ان کی جان کے دشمن تھے۔"

محمد نے اثبات میں اپنا سر ہلایا اور میں نے محسوس کیا کہ میں اپنے کام میں کامیاب ہو گیا ہوں۔

ایک اور دن میں نے اس سے کہا: "کیا عورتوں کے ساتھ متعہ جائز ہے؟"

اس نے کہا: "ہرگز نہیں۔"

میں نے کہا: "پھر کیوں قرآن نے اسے جائز قرار دیتے ہوئے کہا ہے: اور جب تم ان سے متعہ کرو تو ان کا مہر ادا کرو۔"[1]

اس نے کہا: "ہاں آیت تو اپنی جگہ ٹھیک ہے مگر حضرت عمر نے اسے یہ کہہ کر حرام قرار دیا کہ: متعہ پیغمبرؐ کے زمانے میں حلال تھا، میں اسے حرام قرار دیتا ہوں اور اب جو اس کا مرتکب ہوگا میں اسے سزا دوں گا۔"[2]

میں نے کہا: بڑی عجیب بات ہے۔ تم تو حضرت عمر کی پیروی کرتے ہو اور پھر اپنے آپ کو اس سے زیادہ صاحبِ عقل بھی کہتے ہو۔ حضرت عمر کو کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ حلالِ محمدؐ کو حرام کریں۔ تم نے قرآن کو بھلا کر حضرت عمر کی رائے کو تسلیم کر لیا؟

محمد نے چپ سادھ لی اور خاموشی اس کی رضامندی کی دلیل تھی۔ اس موضوع پر اس کے خیالات درست کر کے میں نے اس کے جنسی غریزہ کو ابھارنا شروع کیا۔ وہ ایک غیر متاہل شخص تھا۔ میں نے اس سے پوچھا: "کیا تم متعہ کے ذریعے اپنی زندگی کو پُرمسرّت بنانا چاہتے ہو؟"

محمد نے رضا و رغبت کی علامت سے اپنا سر جھکا لیا۔

---

[1] فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهِ مِنْهُنَّ فَآتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ. (سورۂ نساء آیت ۲۴)
[2] مُتْعَتَانِ كَانَتَا عَلَىٰ عَهْدِ رَسُولِ اللّٰهِ وَأَنَا أُحَرِّمُهُمَا وَأُعَاقِبُ عَلَيْهِمَا.

میں اپنے فرائض کے انتہائی اہم موڑ پر پہنچ چکا تھا۔ میں نے اس سے وعدہ کیا کہ میں بہر حال تمہارے لیے اس کا انتظام کروں گا۔ مجھے صرف اس بات کا خدشہ تھا کہ کہیں محمد بصرہ کے ان سنیوں سے خوف زدہ نہ ہو جائے جو اس بات کے مخالف تھے۔ میں نے اسے اطمینان دلایا کہ ہمارا پروگرام بالکل مخفی رہے گا یہاں تک کہ عورت کو بھی تمہارا نام نہیں بتایا جائے گا۔ اس گفتگو کے فوراً بعد میں اس بد قماش نصرانی عورت کے پاس گیا جو انگلستان کے نوآبادیاتی علاقوں کی وزارت کی طرف سے بصرہ میں عصمت فروشی پر مامور تھی اور مسلم نوجوانوں کو بے راہ روی پر ابھارتی تھی۔ میں نے اس سے تمام واقعات بیان کیے۔ جب وہ راضی ہو گئی تو میں نے اس کا عارضی نام "صفیہ" رکھا اور کہا کہ میں شیخ کو لے کر اس کے پاس آؤں گا۔

مقررہ دن میں شیخ محمد کو لے کر صفیہ کے گھر پہنچا۔ ہم دونوں کے سوا وہاں اور کوئی نہیں تھا۔ محمد نے ایک اشرفی مہر پہ ایک ہفتہ کے لیے صفیہ سے عقد کیا۔ مختصر یہ کہ میں باہر اور صفیہ اندر سے محمد بن عبد الوہاب کو اپنے آئندہ کے پروگراموں کے لیے تیار کر رہے تھے۔ صفیہ نے احکامِ دین کی پامالی اور آزادئ رائے کا پرکیف مزہ محمد کو چکھا دیا تھا۔

میں اس تقریب کے تیسرے دن پھر محمد سے ملا اور ہم نے

ایک بار پھر اپنی گفتگو کا سلسلہ جاری کیا۔ اس بار گفتگو شراب کی حرمت کے متعلق تھی۔ میری کوشش تھی کہ میں ان آیات کو رد کروں جو محمد کے نزدیک حرمتِ شراب پر دلیل تھیں۔ میں نے اس سے کہا: "اگر معاویہ، یزید، خلفائے بنو امیہ اور بنی عباس کی شراب نوشی ہمارے نزدیک مسلّم ہو تو کیونکر ہو سکتا ہے کہ یہ تمام پیشوایانِ دین و مذہب گمراہی کی زندگی بسر کرتے ہوں اور تنہا تم سچے راستے پر ہو؟ بے شک وہ لوگ کتابِ الٰہی اور سنتِ رسولؐ کو ہم سے زیادہ بہتر جانتے تھے۔ پس یہ بات سامنے آتی ہے کہ ارشاداتِ خدا اور رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے ان بزرگوں نے جو استنباط کیا تھا وہ شراب کی حرمت نہیں بلکہ اس کی کراہت تھی۔ اس کے علاوہ یہود و نصاریٰ کی مقدس کتابوں میں صراحت سے شراب پینے کی اجازت ہے حالانکہ یہ بھی الٰہی ادیان ہیں اور اسلام ان ادیان کے پیغمبروں کا معتقد ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ شراب اللہ کے بھیجے ہوئے ایک دین میں حلال اور دوسرے میں حرام ہو؟ کیا یہ سب ادیان برحق یا خدائے یکتا کے بھیجے ہوئے نہیں ہیں؟ ہمارے پاس تو یہ بھی روایت ہے کہ حضرت عمر اس وقت تک شراب پیتے رہے جب تک یہ آیت نازل نہیں ہوئی: "کیا تم شراب اور جوئے سے دستبردار نہیں ہو گے"[1] اگر شراب حرام ہوتی تو رسولِ خدا

[1] فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ ۔ (سورۂ مائدۃ آیت ۹۱)

حضرت عمر کی شراب نوشی پر حد جاری فرماتے مگر آپ کا ان پر حد جاری نہ کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ شراب حرام نہیں ہے۔"

محمد جو بڑے غور سے میری گفتگو سن رہا تھا اچانک سنبھلا اور کہا:
"روایات میں ہے کہ حضرت عمر شراب میں پانی ملا کر پیتے تھے تاکہ اس کی وہ کیفیت دُور ہو جائے جو نشہ پیدا کرتی ہے۔ وہ کہتے تھے شراب کی مستی حرام ہے نہ کہ خود شراب۔ وہ شراب جس سے نشہ طاری نہ ہو حرام نہیں ہے۔"

محمد، حضرت عمر کے اس نظریہ کو اس آیت کی روشنی میں درست جانتا تھا جس میں ارشاد ہوتا ہے "شیطان چاہتا ہے کہ تمہارے درمیان شراب اور جوے کے ذریعے عداوت اور دشمنی پیدا کرے اور تمہیں یادِ خدا اور نماز سے باز رکھے۔"[1]

اگر شراب میں مستی اور نشہ نہ ہو تو پینے والے پر اس کے اثرات مرتب نہیں ہوں گے اور اسی لیے وہ شراب جس میں مستی نہیں حرام نہیں ہے۔

میں نے محمد کے ساتھ شراب سے متعلق گفتگو کو صفیہ کے گوش گزار کیا اور اسے تاکید کی کہ موقع ملتے ہی محمد کو نشہ میں چور کر دو

---

[1] إِنَّمَا يُرِيدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ ۚ (سورۂ مائدۃ آیت ۹۱)

اور جتنا ہو سکے شراب پلاؤ۔

دوسرے دن صفیہ نے مجھے اطلاع دی کہ اس نے شیخ کے ساتھ جی کھول کر شراب نوشی کی یہاں تک کہ وہ آپے سے باہر ہو گیا اور چیخنے چلانے لگا۔ رات کی آخری گھڑی میں کئی مرتبہ میں نے اس سے مقاربت کی اور اب اس پر نقاہت کا عالم طاری ہے اور چہرے کی آب و تاب ختم ہو چکی ہے۔ خلاصہ کلام یہ کہ میں اور صفیہ پوری طرح محمد پہ چھا چکے تھے۔ اس منزل پر مجھے نوآبادیاتی علاقوں کے وزیر کی وہ سنہری بات یاد آئی جو اس نے مجھے الوداع کہتے وقت کہی تھی۔ اس نے کہا تھا:

"ہم نے اسپین کو کفار (مراد اہل اسلام ہیں) سے شراب اور جوئے کے ذریعے دوبارہ حاصل کیا۔ اب انہیں دو طاقتوں کے ذریعے دوسرے علاقوں کو بھی پامردی کے ساتھ واپس لینا ہے۔"

محمد کے ساتھ مذہبی گفتگو کے دوران ایک دن میں نے روزہ کے مسئلہ کو ہوا دی اور کہا: "قرآن کہتا ہے: "روزہ تمہارے لیے بہتر ہے"۔[1] اس نے یہ نہیں کہا کہ تم پر واجب ہے" لہٰذا اسلام میں روزہ واجب نہیں مستحب ہے۔"

---

[1] وَأَنْ تَصُومُوا خَيْرٌ لَكُمْ (سورۂ بقرۃ آیت ۱۸۴)

اس موقع پر محمد کو غصہ آیا اور اس نے کہا: "تم مجھے دین سے خارج کرنا چاہتے ہو۔"

میں نے کہا: "اے محمد، دین قلب کی پاکی، جان کی سلامتی اور اعتدال کا نام ہے۔ یہ کیفیات انسان کو دوسروں پر ظلم و زیادتی سے روکتی ہیں۔ کیا حضرت عیسیٰؑ نے یہ نہیں کہا کہ مذہب عشق و وارفتگی کا نام ہے۔" کیا قرآن یہ نہیں کہتا: "یقین حاصل کرنے تک اللہ کی عبادت کرو۔[1] اب اگر انسان یقین کامل کی منزل پر پہنچ جائے، خدا اور روز قیامت اس کے دل میں راسخ ہو جائیں، ایمان سے اس کا دل لبریز ہو جائے اور وہ اچھے سلوک کا حامل ہو تو پھر روزہ کی کیا ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟ اس منزل میں وہ اعلیٰ ترین انسانی مراتب سے وابستہ ہو جاتا ہے۔"

محمد بن عبدالوہاب نے اس مرتبہ میری شدید مخالفت کی اور اپنی ناراضگی کا اظہار کیا۔ پھر ایک دفعہ میں نے اس سے کہا: "نماز واجب نہیں۔"

اس نے پوچھا: "کیوں؟"

میں نے کہا: اس لیے کہ خداوند عالم نے قرآن میں کہا ہے کہ: "مجھے یاد کرنے کے لیے نماز قائم کرو۔"[2] پس نماز کا مقصود ذکر الٰہی

---

[1] وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَأْتِيَكَ الْيَقِيْنُ ۔ (سورۂ حجر آیت ۹۹)

[2] وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ ۔ (سورۂ طٰہٰ آیت ۱۴)

ہے، اور تمہیں چاہیے کہ تم اس کا نام اپنی زبان پر جاری رکھو۔"
محمد نے کہا: "ہاں میں نے سنا ہے کہ بعض علمائے دین نماز کے وقت اللہ کے نام کی تکرار شروع کرتے ہیں اور نماز ادا نہیں کرتے۔"

میں محمد کے اس اعتراف سے بہت زیادہ خوش ہوا اگرچہ احتیاطاً کچھ دیر میں نے اسے نماز پڑھنے کی تلقین بھی کی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس سے نماز کی پابندی چھوٹ گئی۔ اب وہ کبھی نماز پڑھتا اور کبھی نہ پڑھتا۔ خاص طور سے صبح کی نماز غالباً اس نے ترک ہی کر دی تھی۔ ہم لوگ رات کو دیر تک جاگتے جس کی وجہ سے صبح اٹھنے اور وضو کرنے کی اس میں ہمت باقی نہیں رہتی تھی۔

قصہ مختصر، آہستہ آہستہ میں محمد کے بدن سے ایمان کا لبادہ اتارنے میں کامیاب ہو گیا۔ میں ہر روز اس سے اپنی میٹھی گفتگو کا سلسلہ جاری رکھتا۔ انجام کار ایک دن میں نے گفتگو کی حدود کو جناب رسولِ خدا (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ذات (اقدس) تک آگے بڑھایا۔ اچانک اس کے چہرے پر تبدیلی آئی اور وہ اس موضوع پر گفتگو کے لیے تیار نہیں ہوا۔ اس نے مجھ سے کہا: "اگر تم نے رسول خدا (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی شان میں گستاخی کی تو ہماری تمہاری دوستی کے دروازے ہمیں سے ہمیشہ کے لیے بند ہو جائیں گے۔"
میں نے اپنی محنتوں پر پانی پھرتے دیکھا تو فوراً اپنا موضوع گفتگو

بدل دیا اور پھر اس موضوع پر گفتگو نہیں کی۔

اس دن کے بعد سے میرا مقصد محمد بن عبدالوہاب کو رہبری اور پیشوائی کی فکر دینا ہو گیا۔ مجھے اس کے قلب و روح میں اتر کر شیعہ سنی فرقوں کے علاوہ اسلام میں ایک تیسرے فرقے کی سربراہی کی پیش کش کو اسکے لیے قابل عمل بنانا تھا۔ اس مقصد کے حصول کے لیے ضروری تھا کہ پہلے میں اس کے ذہن کو بیجا مجنتوں اور اندھے تعصبات سے پاک کردوں اور اس عنوان سے اس کی آزاد خیالی اور بلند پروازی کو تقویت پہنچاؤں۔ اس کام میں صفیہ بھی میری مددگار تھی کیونکہ محمد اسے دیوانوں کی طرح چاہتا تھا اور ہر ہفتہ متعہ کی مدت کو بڑھاتا جاتا تھا۔ مختصر یہ کہ صفیہ نے محمد سے صبر و قرار اور اس کے تمام اختیارات چھین لیے تھے۔

میں نے اپنی ایک ملاقات میں محمد سے کہا: "کیا یہ درست ہے کہ جناب رسولِ خدا (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی تمام اصحاب سے دوستی تھی؟"

اس نے جواب دیا: "ہاں!"

میں نے پوچھا: "اسلام کے قوانین دائمی ہیں یا وقتی؟"

اس نے کہا: "بے شک دائمی ہیں" اس لیے کہ رسولِ خدا فرماتے ہیں کہ: "کہ حلالِ محمدؐ قیامت تک حلال اور حرامِ محمدؐ

قیامت تک حرام ہے"۔ [1]

میں نے بلا تاخیر کہا: "پس ہمیں بھی ان کی سنت پر عمل کرتے ہوئے ایک دوسرے کا دوست اور بھائی بننا چاہیے"۔

اس نے میری پیشکش کو قبول کیا اور اس دن کے بعد سے تمام سفر وحضر میں ہم ایک دوسرے کے ساتھ رہنے لگے۔

میں اس کوشش میں تھا کہ جس پودے کو سینچنے میں میں نے اپنی جوانی کے دن صرف کیے ہیں اب جتنی جلد ہو سکے اس کے پھلوں سے استفادہ کروں۔

حسب معمول میں اپنے ہر مہینے کی رپورٹ انگلستان میں نوآبادیاتی علاقوں کی وزارت کو بھیجتا رہا۔ رپورٹ لکھنا اب میری عادت میں شامل ہو گیا تھا جس میں کبھی میں کوتاہی نہیں کرتا تھا۔ وہاں سے جو جوابات لکھے جاتے تھے وہ تمام کے تمام بڑے حوصلہ افزا اور پر امید ہوا کرتے تھے اور اپنے فرائض کی انجام دہی میں میری ہمت بڑھاتے تھے۔ میں اور محمد نے جس راستے کا تعین کیا تھا ہم اسے بڑی تیزی سے طے کر رہے تھے۔ میں سفر اور حضر میں کبھی اس کو تنہا نہیں چھوڑتا تھا۔ میری کوشش یہی تھی کہ میں آزاد خیالی

---

[1] حَلَالُ مُحَمَّدٍ حَلَالٌ اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ وَحَرَامُ مُحَمَّدٍ حَرَامٌ اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ۔

اور مذہبی عقائد میں جدت پسندی کی روح کو اس کے وجود میں استحکام بخشوں۔ میں ہمیشہ اس کو یہ آس دلاتا رہتا تھا کہ ایک تابناک مستقبل تمہارے انتظار میں ہے۔

ایک دن میں نے اس سے اپنا ایک جھوٹا خواب بیان کیا اور کہا: رات میں نے جناب ختمی مرتبت ؐ کو بالکل اسی سراپا کے ساتھ کرسی پر بیٹھے دیکھا جیسے ذاکرین اور واعظین منبروں پہ بیان کرتے رہتے ہیں۔ بڑے بڑے علماء اور بزرگان دین نے جن سے میری کوئی واقفیت نہیں تھی چاروں طرف سے ان کو گھیر رکھا تھا۔ ایسے میں، میں نے دیکھا کہ اچانک تم اس مجمع میں داخل ہو گئے۔ تمہارے چہرے سے نور کی شعاعیں پھوٹ رہی تھیں۔ جب تم رسالتمآب (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے سامنے پہنچے تو انھوں نے کھڑے ہو کر تمہاری تعظیم کی اور ماتھا چوما اور کہا: "اے میرے ہمنام محمد تم میرے علم کے وارث اور مسلمانوں کے دینی اور دنیاوی امور کو سنوارنے میں میرے جانشین ہو۔"

یہ سن کر تم نے کہا: "یارسول اللہ! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) لوگوں پر اپنے علم کو ظاہر کرتے ہوئے مجھے خوف محسوس ہوتا ہے۔"

جناب رسالتمآب ؐ نے فرمایا: خوف کو اپنے دل میں جگہ نہ دو کیونکہ جو کچھ تم اپنے بارے میں سوچتے ہو، اس سے کہیں زیادہ صاحب مرتبہ ہو۔

محمد بن عبدالوہاب نے میرے اس من گھڑت خواب کو سنا تو خوشی سے پھولا نہیں سمایا۔ وہ بار بار مجھ سے پوچھتا تھا کیا تمہارے خواب سچے ہوتے ہیں؟ اور میں اسے مسلسل اطمینان دلاتا رہا۔ میں نے محسوس کیا کہ خواب کے تذکرے کے ساتھ ہی اس نے اپنے دل میں نئے مذہب کے اعلان کا مصمم ارادہ کر لیا ہے۔

۵

اسی دوران لندن سے مجھے خط پہنچا کہ میں فوراً کربلا اور نجف کے ان مقدس شہروں کی طرف روانہ ہو جاؤں جو شیعوں کے لیے قبلۂ آرزو اور علم و روحانیت کے مراکز ہیں۔ اب سب سے پہلے میں مقدمہ کے طور پر ان دونوں مقدس شہروں کا ایک نہایت مختصر تاریخی پس منظر پیش کرنا چاہتا ہوں۔

اہل تشیع کے پہلے امام اور عامتہ المسلمین کے چوتھے خلیفہ حضرت علیؑ کی تدفین شہر نجف کی اہمیت کا سر لوحۂ آغاز ہے اور یہیں سے اس بستی کا وجود عمل میں آتا ہے اور یہ روز بروز پھیلتی چلی جاتی ہے اور یہ سلسلہ آج تک جاری ہے حضرت علیؑ کی شہادت کے وقت مرکز خلافت یعنی کوفہ سے نجف کا فاصلہ چھ کلو میٹر تھا جسے پیدل ایک گھنٹے میں طے کیا جا سکتا تھا۔ آپ کی شہادت کے بعد

جناب حسنینؑ آپ کے جنازے کو پوشیدہ طور پر اس دور افتادہ علاقہ میں لائے جسے آج نجف کہا جاتا ہے اور رات کی تاریکی میں آپ کو دفن کر دیا۔ اب یہ شہر بین النہرین کا سب سے بڑا علاقہ کہلاتا ہے اور اس کی آبادی کوفہ سے کہیں زیادہ ہے۔ اس جگہ اہل تشیع کا حوزۂ علمیہ قائم ہے اور دنیا بھر کے علماء نے اس شہر میں بسیرا اختیار کیا ہے۔ ہر سال اس کے بازاروں، مدرسوں اور گھروں میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ شیعہ علماء خصوصی احترام کے حامل ہیں۔ استنبول میں مقیم عثمانی خلیفہ مندرجہ ذیل وجوہات کی بنا پر ان کا بڑا احترام کرتا تھا۔

۱۔ ایران کا بادشاہ شیعہ مذہب کا پیرو کار تھا اور علمائے نجف کی نسبت عثمانی سلاطین کا احترام ایران اور ترکی کے دوستانہ روابط میں استحکام کا باعث تھا اور اس طرح دونوں ممالک میں جنگ کا کھٹکا ختم ہو جاتا تھا۔

۲۔ نجف کے اطراف و اکناف میں بہت سے قبائل آباد تھے جو سب کے سب مسلح اور سختی سے شیعہ مراجع کے پیرو کار تھے۔ ان کے پاس فوجی اسلحہ اور فوجی تربیت نہیں تھی۔ یہ لوگ قبائلی زندگی کے عادی تھے لیکن علماء کی توہین برداشت نہیں کر سکتے تھے لہٰذا اگر عثمانیوں کی طرف سے علماء کی بے احترامی عمل میں آتی تو وہ سب کے سب عثمانیوں

کے خلاف متحد ہو جاتے اور یہ کوئی عقلمندی کی بات نہ تھی کہ استنبول کی خلافت ایسا خطرہ اپنے لیے مول لیتی۔

۳۔ ساری دنیائے تشیع میں شیعہ علماء کی مرجعیت قائم تھی لہٰذا اگر عثمانیوں کی طرف سے ذرہ برابر بھی ان کی اہانت ہوتی تو ایران، ہندوستان، افریقہ اور دنیا کے تمام ممالک کے شیعہ برافروختہ ہوتے اور یہ بات ترک حکومت کے حق میں نہ تھی۔

اہل تشیع کا دوسرا مقدس شہر کربلائے معلیٰ ہے۔ یہ شہر بھی حضرت علیؑ اور حضرت فاطمہؑ کے فرزند حضرت امام حسینؑ کی شہادت کے بعد آج تک مسلسل پھیل رہا ہے۔ عراق کے لوگوں نے امام حسینؑ کو دعوت دی کہ آپ مسلمانوں کے امر خلافت کو سنبھالنے کے لیے حجاز سے کوفہ تشریف لائیں لیکن جونہی آپ اپنے خاندان کے ساتھ کربلا پہنچے جو کوفہ سے تقریباً ۷۲ کیلومیٹر کے فاصلہ پر ہے عراق کے لوگوں کا مزاج بدل گیا اور وہ یزید کے حکم پر امام کے خلاف لڑنے پر آمادہ ہو گئے۔

یزید بن معاویہ اموی خلیفہ تھا جس کی شام پر حکومت تھی۔ اموی لشکر، حسینؑ اور ان کے گھرانے سے برسرپیکار رہا اور آخر کار ان سب کو قتل کر دیا۔ عراقیوں کی یہ بزدلی اور یزیدی لشکر کی پلیدی اور سنگدلی اسلامی تاریخ کی سب سے زیادہ شرمناک داستان ہے۔ اس واقعے کے بعد سے آج تک دنیا کے تمام شیعہ کربلا کو

زیارت، عبادت، روحانی لگاؤ اور توجہ کا مرکز بنائے ہوئے ہیں اور ہر طرف سے جوق در جوق وہاں پہنچتے ہیں۔ کبھی تو اتنا مجمع ہوتا ہے کہ تاریخ مسیحیت میں کبھی ایسا اجتماع دیکھنے میں نہیں آیا۔ کربلا کے شہر میں بھی شیعہ علماء اور مراجع دین اسلام کی تعلیم و ترویج میں ہمیشہ مصروف نظر آتے ہیں۔ یہاں کے دینی مدرسے طالب علموں سے بھرے رہتے ہیں۔ کربلا اور نجف بالکل ایک دوسرے کے مماثل ہیں۔ دجلہ و فرات عراق کے دو بڑے دریا ہیں جن کا سرچشمہ ترکی کا ایک کوہستانی علاقہ ہے۔ بین النہرین کی کھیتیاں اسی کے دم سے آباد ہیں اور یہاں کے لوگوں کی خوشحالی انہیں دریاؤں کی مرہونِ منت ہے۔

جب میں لندن واپس گیا تو میں نے نوآبادیاتی علاقوں کی وزارت کو یہ پیشکش کی کہ وہ حکومت عراق کو اپنا فرمانبردار بنانے کے لیے دجلہ و فرات کے سنگم کو کنٹرول کرے اور شورش اور بغاوت کے موقع پر اس کے راستے کو تبدیل کرے تاکہ وہاں کے لوگ انگریزوں کے استعماری مقاصد کو ماننے پر مجبور ہو جائیں۔

میں ایک بربری سوداگر کے بھیس میں نجف پہنچا اور وہاں کے شیعہ علماء سے رسم و راہ بڑھانے کے لیے ان کی درسی مجلسوں اور مباحثہ کی محفلوں میں شرکت کرنے لگا۔ محفلیں بیشتر اوقات مجھے اپنے اندر جذب کر لیتی تھیں کیونکہ ان میں قلب و ضمیر کی پاکی حکم فرما تھی۔ میں نے شیعہ علماء کو انتہائی پاک دامن اور پرہیزگار پایا لیکن افسوس کہ

ان میں زمانے کی تبدیلی کے اثرات کا فقدان تھا اور دنیا کے انقلابات
نے ان کی فکر میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کی تھی۔

۱۔ نجف کے علماء اور مراجع عثمانی حکام کے شدید مخالف تھے اس لیے نہیں کہ وہ سنی تھے بلکہ اس لیے کہ وہ ظالم تھے اور عوام ان سے ناخوش تھے اور اپنی نجات کے لیے ان کے پاس کوئی راستہ نہیں تھا۔

۲۔ وہ لوگ اپنا تمام وقت درس و تدریس اور دینی علوم و مباحث پر صرف کرتے تھے اور قرون وسطی کے پادریوں کی طرح انہیں جدید علوم سے دلچسپی نہیں تھی اور اگر کچھ جانتے بھی تھے تو وہ ان کے لیے نہ جاننے کے برابر تھا۔

۳۔ انھیں دنیا کے سیاسی واقعات کا قطعاً علم نہ تھا اور اس قسم کے مسائل پر سوچنا ان کے نزدیک بالکل عبث اور بیہودہ تھا۔ انھیں دیکھ کر میں آپ ہی آپ کہتا تھا: واقعی یہ لوگ کتنے بدبخت ہیں۔ دنیا جاگ چکی ہے مگر یہ ابھی خوابِ خرگوش ہی میں پڑے ہیں۔ شاید کوئی تباہ کن موج ہی ان کو اس خوابِ گراں سے بیدار کرے۔ میں نے بعض علماء سے خلافتِ عثمانیہ کے خلاف تحریک چلانے پر گفتگو کی لیکن انھوں نے اپنی طرف سے کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ لوگ اس قسم کے مسائل سے دلچسپی نہیں رکھتے۔ بعض لوگ میرا مذاق

اڑاتے تھے اور میری بات کا یہ مفہوم نکالتے تھے کہ میں دنیا کے حالات کو دگرگوں اور نظم عالم کو برہم کرنا چاہتا ہوں۔ ان علماء کی نظر میں خلافت مفقود و محتوم تھی۔ ان کا عقیدہ تھا کہ انھیں ظہور مہدی موعودؑ (عجل اللہ فرجہ) سے پہلے آلِ عثمان کے خلاف کوئی اقدام نہیں کرنا چاہیے۔ مہدی موعودؑ شیعوں کے بارھویں امام ہیں جو بچپن ہی سے پردۂ غیبت میں چلے گئے ہیں اور ابھی تک زندہ ہیں۔ آخری زمانے میں ان کا ظہور ہوگا اور وہ اس وقت دنیا کو عدل و انصاف سے بھر دیں گے جب وہ مکمل طور پر ظلم و زیادتی سے بھر چکی ہوگی۔

میں اس طرح کا عقیدہ رکھنے والے اسلامی دانشمندوں کے بارے میں سخت حیران تھا۔ ان کا عقیدہ بعینہٖ قشری عیسائیوں کا عقیدہ تھا جو قیام عدل کے لیے حضرت عیسیٰؑ کی بازگشت کے قائل تھے۔ میں نے ایک عالم سے پوچھا: کیا آپ کا یہ عقیدہ نہیں ہے کہ ابھی سے ظلم و زیادتی کے خلاف رزم آرا ہو کر دنیا میں اسلام کا بول بولا کیا جائے؟ بالکل اسی طرح جیسے پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ظالموں کے خلاف جہاد کیا تھا؟

انھوں نے فرمایا: پیغمبر اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو خدا نے اسی کام کے لیے مامور کیا تھا اور اسی لیے ان میں اس کام کو انجام دینے کی توانائی تھی۔

میں نے کہا: کیا قرآن یہ نہیں کہتا کہ: "اگر تم اللہ کی مدد کرو گے

تو اللہ بھی تمہارا مددگار ہوگا"[1] لہٰذا تم بھی اللہ کی طرف سے ظالموں کے خلاف تلوار اٹھانے پر مامور ہو۔

آخر کار زچ ہو کر اس نے کہا: "تم ایک تجارت پیشہ آدمی ہو اور ان موضوعات پر گفتگو کے لیے ایک سلسلۂ علم کی ضرورت ہے جس کے لیے تم مناسب نہیں ہو"

اب ذرا نجف کی طرف آئیں اور حضرت علیؑ کے روضہ کے بارے میں گفتگو کریں۔ بڑی پرشکوہ اور باعظمت آرامگاہ ہے۔ پوری عمارت صناعی، نقاشی، آئینہ کاری اور مختلف سجادوں کا بے مثال شاہکار ہے۔ اطراف مزار بڑے بڑے پُرشکوہ کمرے، طلائی ناب کا عظیم گنبد اور سونے کے دو مینارے ایک عجیب منظر پیش کرتے ہیں۔ شیعہ حضرات ہر روز گروہ در گروہ روضہ کی زیارت کے لیے حاضر ہوتے ہیں اور وہاں کی نمازِ جماعت میں شرکت کرتے ہیں۔ وہ لوگ بڑے والہانہ انداز میں اخلاص و ارادت کا مجسمہ بن کر ضریح کو بوسہ دیتے ہیں۔ داخلہ سے پہلے عاشقانِ امام دروازے کی چوکھٹ پر اپنے آپ کو گرا دیتے ہیں اور بڑے احترام سے بارگاہ کی زمین کو چومتے ہیں۔ پھر امام علیؑ پر درود بھیجتے ہیں اور اذنِ دخول پڑھ کر حرم میں داخل ہوتے ہیں۔ حرم کے چاروں طرف ایک عظیم الشان صحن ہے جس میں

---

[1] اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ۔ (سورۂ محمد آیت ۷)

بہت سے کمرے بنے ہوئے ہیں جو علمائے دین اور زائرین حرم کی اقامت گاہ ہیں۔

کربلائے معلیٰ میں دو مشہور آرامگاہیں ہیں جو تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ نجف میں واقع حضرت علیؑ کی آرامگاہ کے طرز پر بنائی گئی ہیں۔ پہلی آرامگاہ امام حسینؑ کی اور دوسری حضرت عباسؑ کی ہے۔ کربلا کے زائرین بھی نجف کی طرح روزانہ حرم میں حاضری دیتے ہیں اور امام کی زیارت کرتے ہیں۔ کربلا مجموعی طور پر نجف سے زیادہ خوش منظر ہے۔ چاروں طرف ہرے بھرے خوشنما باغات اور ان کے درمیان دریا کے بہتے پانی نے اسکی خوبصورتی میں چار چاند لگا دیے ہیں۔

ان شہروں کی ویرانی اور آشفتہ حالی نے ہماری کامیابی کے مواقع فراہم کر رکھے تھے۔ لوگوں کی حالتِ زار کو دیکھ کر یہ اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ عثمانی حکام نے ان شہروں کے رہنے والوں کے ساتھ کن کن جرائم کا ارتکاب کیا اور کیسی کیسی زیادتیاں کیں۔ یہ لوگ بڑے نادان، لالچی اور خود سر تھے اور جو چاہتے تھے کر گزرتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ عراق کے لوگ ان کے زر خرید غلام ہیں۔ پوری قوم حکومت سے نالاں تھی اور جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں شیعہ حضرات اپنی آزادی کے چھن جانے کے باوجود حکام کے ظلم و ستم کو صبر و سکون سے سہہ رہے تھے اور کوئی ردِّ عمل ظاہر

نہیں کر رہے تھے۔ اہل سنت حضرات کا بھی یہی حال تھا۔ وہ لوگ اپنی سرزمین پر ترک گورنر کے تسلط سے بہت ناخوش تھے خاص طور پر جبکہ ان کی رگوں میں عرب اشرافیت کا خون دوڑ رہا تھا۔ ادھر خاندان رسالت سے وابستگی رکھنے والے افراد حکومتی انتظامات میں اپنے آپ کو عثمانی گورنر سے زیادہ حقدار سمجھتے تھے۔

تمام بستیاں ویران تھیں۔ گرد و غبار بستی والوں کا مقدر بن چکا تھا۔ ہر طرف بدنظمی کا دور دورہ تھا۔ راستوں پر لٹیرے قابض تھے اور اس تاک میں بیٹھے رہتے تھے کہ حکومت کی سرپرستی سے آزاد کوئی قافلہ وہاں سے گزرے اور وہ انھیں لوٹنا شروع کر دیں لہٰذا بڑے بڑے قافلے صرف اسی وقت منزل مقصود تک پہنچ سکتے تھے جب انھیں مسلح آدمیوں کے ذریعے حکومت کی حمایت حاصل ہو۔

دوسری طرف قبائلی جھڑپوں میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ کوئی دن ایسا نہ تھا جس میں ایک قبیلہ دوسرے قبیلہ پر حملہ آور نہ ہو اور قتل و غارتگری کا بازار گرم نہ ہوتا ہو۔ روزانہ کئی افراد موت کے گھاٹ اتر جاتے تھے۔ نادانی اور بے علمی نے پورے عراق کو عجیب طرح اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ یہ واقعات قرون وسطیٰ میں پادریوں کے دور کی یاد تازہ کر رہے تھے۔ صرف نجف اور کربلا کے علماء اس سے مستثنیٰ تھے یا پھر کسی قدر طالب علم یا وہ لوگ جن کا ان علماء سے میل جول تھا ورنہ سب کے سب جاہل تھے۔ ملکی اقتصاد کا پہیہ

عام ہوگیا تھا اور بیماری، بیروزگاری، جہالت اور بدبختیوں نے شدت سے متوسط لوگوں کا گھر دیکھ لیا تھا۔ مملکت کا شیرازہ بکھر چکا تھا۔ ہر طرف ایک ہنگامہ بپا تھا۔ حکومت اور عوام کے درمیان مفاہمت کی کمی تھی اور وہ ایک دوسرے کو اپنا دشمن سمجھتے تھے۔ ان کا ایک دوسرے کے ساتھ تعاون نہیں تھا۔ علمائے دینِ الٰہی مسائل میں اس طرح غرق تھے کہ دنیا کی زندگی ان کی نظروں سے اوجھل ہوگئی تھی۔

زمین خشک اور کھیتیاں اجاڑ تھیں۔ دجلہ و فرات کے دونوں دریا کھیتوں کو سیراب کرنے کے بجائے ایک آشفتہ سر مہمان کی طرح پیاسی زمینوں کے بیچ سے بسرعت گزر رہے تھے۔ ملک کی یہ آشفتہ حالی یقیناً ایک انقلاب کا پیش خیمہ تھی۔

مختصر یہ کہ میں نے کربلا اور نجف میں چار مہینے گزارے۔ نجف میں، میں ایک ایسی بیماری میں مبتلا ہوا کہ جینے کی آس ٹوٹ گئی۔ تین ہفتے تک میری بری حالت تھی۔ آخر کار مجھے شہر کے ایک ڈاکٹر سے رجوع کرنا پڑا۔ اس نے میرے لیے کچھ دوائیں تجویز کیں جن کے استعمال سے میں بتدریج بہتر ہوتا چلا گیا۔ اس سال گرمی بھی بڑی شدید اور ناقابل برداشت تھی اور میں نے اپنی بیماری کا تمام وقت ایک تہہ خانے میں گزارا جو کسی قدر پُرسکون اور ٹھنڈا تھا۔ میرا مالکِ مکان میرے دیے ہوئے مختصر پیسے سے میرے لیے دوا دارو

اور کھانے پینے کا انتظام کرتا تھا۔ وہ حضرت علیؑ کے زواروں کی خدمت کو تقربِ الٰہی کا ذریعہ سمجھتا تھا۔ بیماری کے ابتدائی دنوں میں میری غذا مرغ کا سوپ تھا لیکن بعد میں ڈاکٹر کی اجازت سے میں نے گوشت اور چاول بھی استعمال کرنا شروع کیا۔

بیماری سے کسی قدر افاقہ کے بعد میں بغداد روانہ ہوا اور وہاں جا کر میں نے کربلا، نجف، حلہ اور بغداد سے متعلق اپنے مشاہدات کو تقریباً سو صفحات پر مشتمل ایک رپورٹ میں نوآبادیاتی علاقوں کی وزارت کے لیے رقم کیا اور لندن بھیجنے کے لیے اسے بغداد میں مذکورہ وزارت کے نمائندہ کے سپرد کیا اور اپنے رکنے یا لندن واپس جانے سے متعلق احکامات کے انتظار میں بیٹھا رہا۔

یہاں یہ بات بھی بتاتا چلوں کہ میں واپسی کے لیے بہت بے قرار تھا کیونکہ اپنے دیس، خاندان اور عزیز و اقارب سے چھوٹے مجھے ایک عرصہ ہو چکا تھا۔ خاص طور پر رہ رہ کر راسپوٹین کا خیال آ رہا تھا جو میری عراق روانگی کے کچھ عرصے بعد ہی اس دنیا میں وارد ہوا تھا۔ اس نومولود کی یاد مجھے بہت بے چین کر رہی تھی۔ اسی باعث میں نے درخواست میں ایک مختصر عرصے کے لیے واپس لندن آنے کی اجازت چاہی تھی۔ مجھے عراق میں تین سال کا عرصہ ہو چکا تھا۔ بغداد میں نوآبادیاتی علاقوں کی وزارت کے نمائندہ کا اصرار تھا کہ میں بار بار اس کے پاس نہ جاؤں کیونکہ اس طرح ممکن ہے لوگ مجھے شک کی نگاہ سے دیکھنے لگیں اور

اسی بات کو مدّ نظر رکھتے ہوئے میں نے دجلہ کے قریب ایک مسافر خانے کو اپنا ٹھکانا بنایا۔ نوآبادیاتی علاقہ کی وزارت کے نمائندہ نے کہا تھا کہ لندن سے جواب آتے ہی مجھے باخبر کر دیا جائے گا۔

بغداد میں اقامت کے دوران میں نے اس شہر کا عام حالتوں میں عثمانی حکومت کے پایۂ تخت "قسطنطنیہ" سے موازنہ کیا تو مجھے ان دونوں میں نمایاں فرق محسوس ہوا جو عربوں کی نسبت عثمانیوں کی دشمنی اور بدنیتی کا غماز تھا۔ انھوں نے عراقی شہروں اور عراقی آبادیوں کو حفظانِ صحت کے تمام اصولوں کے برخلاف غلاظت اور گندگی کا مسکن بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔

بصرہ سے کربلا اور نجف پہنچنے کے چند ماہ بعد مجھے شیخ محمد بن عبدالوہاب کا خیال آیا۔ میں اس کی طرف سے بڑا فکرمند تھا۔ میں نے اس پر بڑی محنت کی تھی لیکن مجھے اس پر بھروسہ نہیں تھا کیونکہ وہ متلون مزاج واقع ہوا تھا۔ اس کے علاوہ وہ غصے کا بھی بڑا تیز تھا اور ذرا ذرا سی بات پر آپے سے باہر ہو جایا کرتا تھا۔ ان خصوصیات کے پیش نظر مجھے دھڑکا تھا کہ کہیں میری محنت اکارت نہ جائے اور جس خواہش کو میں ایک عرصہ سے اپنے سینے میں لیے پھر رہا تھا اس پر پانی نہ پھر جائے۔

جس دن میں بصرہ کی سمت روانہ ہو رہا تھا وہ ترکی جانے پر مصر تھا کہ وہاں جا کر اس شہر کے بارے میں معلومات حاصل کرے۔ میں نے بڑی سختی سے اسے اس سفر سے باز رکھا اور کہا مجھے ڈر ہے کہ

تم وہاں جاکر کوئی ایسی الٹی سیدھی بات نہ کر بیٹھو جس سے تم پر کفر و الحاد کا الزام عائد ہو اور تمہارا خون رائیگاں جائے لیکن سچی بات یہ تھی کہ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہاں جاکر وہ بعض علمائے اہلسنت سے کوئی رابطہ قائم کرے کیونکہ اس میں اس بات کا خطرہ تھا کہ کہیں وہ لوگ اپنی محکم دلیلوں کے ذریعے دوبارہ اسے اپنے جال میں نہ پھانس لیں اور میرے تمام منصوبے دھرے کے دھرے رہ جائیں۔

جب میں نے دیکھا کہ محمد بصرہ سے جانے پر مُصر ہے تو مجبوراً میں نے اسے ایران جانے پر ابھارا کہ وہاں جاکر وہ شیراز اور اصفہان کی سیر کرے۔

یہاں اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ ان دونوں شہروں کے رہنے والے شیعہ مذہب کے پیروکار ہیں اور یہ بات بعید از قیاس تھی کہ شیخ ان کے عقائد سے متاثر ہو۔ مجھے اس بارے میں پورا اطمینان تھا کیونکہ میں شیخ کو اچھی طرح جانتا تھا۔

رخصت ہوتے ہوئے میں نے اس سے پوچھا: "تقیہ کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟"

اس نے کہا: "درست ہے کیونکہ پیغمبر اکرمؐ کے ایک صحابی عمارؓ اُن مشرکین کے ڈر سے جنہوں نے اُن کے ماں باپ کو قتل کر دیا تھا اپنے آپ کو مشرک ظاہر کرتے رہے اور ختمی مرتبتؐ نے جناب عمار یاسرؓ کی اس روش کی طرف اشارہ بھی کیا ہے۔"

میں نے اس سے کہا: "پس تم پر بھی واجب ہے کہ ایران جاکر تقیہ کو نہ بھولو اور اپنے آپ کو خالص شیعہ ظاہر کرو تاکہ اعتراضات سے بچے رہو اور علماء کی صحبت بھی تمہیں حاصل رہے اور ساتھ ہی ساتھ ایرانیوں کے آداب و رسوم بھی تم پر کھل جائیں کیونکہ آئندہ چلکر یہ معلومات تمہارے بہت کام آئینگی اور تمہیں اپنے مقاصد میں بڑی کامیابی عطا کرینگی۔

اس گفتگو کے بعد میں نے اسے کچھ رقم "زکوٰۃ" کے عنوان سے دی۔ زکوٰۃ ایک طرح کا اسلامی ٹیکس ہے جسے سرمایہ داروں سے وصول کیا جاتا ہے تاکہ اس آمدنی کو امت کے فلاح و بہبود پر خرچ کیا جائے۔ جاتے ہوئے میں نے راستے ہی میں اسے ایک گھوڑا خرید کر دیا کیونکہ اسے اس کی سخت ضرورت تھی اور پھر میں اس سے الگ ہو گیا اور اس دن سے اب تک اس کی کوئی خبر نہیں ہے اور نہیں معلوم اس پر کیا بیتی ہوگی۔ مجھے زیادہ تشویش اس لیے بھی تھی کہ ہم نے بصرہ سے نکلتے وقت یہ طے کیا تھا کہ ہمیں واپس بصرہ ہی پہنچنا ہے اور اگر ہم میں سے کوئی وہاں نہ پہنچ سکے تو اپنی کیفیت "عبدالرضا ترکھان" کو لکھ بھیجے تاکہ دوسرا اس سے باخبر ہو مگر ابھی تک اس کی طرف سے کوئی اطلاع نہیں ملی تھی۔

٦

کچھ عرصے انتظار کے بعد بالآخر نوآبادیاتی علاقوں کی وزارت سے ضروری احکامات بغداد پہنچے اور میری حکومت نے مجھے فوری طور پر طلب کیا۔ لندن پہنچتے ہی نوآبادیاتی علاقوں کی وزارت کے سیکرٹری اور اعلیٰ عہدہ داروں کے ساتھ ہم نے ایک کمیشن تشکیل دیا۔ ہیں نے اس جلسہ میں اپنے فرائض، اقدامات اور مطالعات پر مبنی رپورٹ کو لندن حکام کے سامنے پیش کیا اور انھیں بین النہرین کی کیفیت سے بھی آگاہ کیا۔

عراق سے متعلق میری فراہم کردہ معلومات اور میری کارگزاریوں نے سب کے دل جیت لیے تھے۔ پہلے بھی عراق سے ہیں نے کئی رپورٹیں ان کے لیے روانہ کی تھیں اور ان سب سے وہ مطمئن تھے۔ دطرصفیہ نے بھی ایک رپورٹ بھیجی تھی جو پوری طرح میری رپورٹ کی تائید

کرتی تھی۔ اس کے علاوہ مجھے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ وزارت خانہ نے میری نگرانی کے لیے کچھ مخصوص افراد کو میرے پیچھے لگا رکھا تھا جو سفر و حضر میں مجھ پہ نگاہ رکھتے تھے۔ ان افراد نے بھی اپنی رپورٹوں میں میرے طرز عمل اور دلچسپی سے رضایت کا اظہار کیا تھا اور ان رپورٹوں کی تصدیق و تائید کی تھی جنہیں میں نے لندن بھیجا تھا۔ اس مرتبہ کلی طور پہ میدان میرے ہاتھ تھا اور سب مجھ سے خوش تھے یہاں تک کہ اس دور کے سیکریٹری نے وزیر سے میری ملاقات کے لیے وقت لیا اور میں اس کے ساتھ وزیر سے ملنے گیا۔ مجھے دیکھتے ہی وزیر کے چہرے پر ایک گونہ شگفتگی آگئی اور بڑے پرتپاک انداز میں خوش آمدید کہتے ہوئے اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ یہ ملاقات گزشتہ کی بے جان اور مختصر ملاقاتوں سے یکسر مختلف تھی جو اس بات کو ظاہر کرتی تھی کہ میں نے اس کے دل میں اپنے لیے جگہ پیدا کر لی ہے۔

وزیر خاص طور سے میری اس مہارت کا معترف تھا جس کی بنیاد پہ میں نے شیخ محمد بن عبدالوہاب کو اپنے قبضے میں کر لیا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ اس نے اپنی گفتگو کے دوران مجھ سے کہا تھا: "محمد پر تسلط نوآبادیاتی وزارت کا سب سے اہم مسئلہ تھا"۔ اس نے بڑی شدت سے یہ تاکید کی تھی کہ میں محمد کو ایک منظم منصوبے کے تحت ان امور سے آگاہ کروں جنہیں آئندہ چل کر اسے ہمارے لیے انجام دینا ہے۔ وہ بار بار اس بات کا اعتراف کر رہا تھا کہ عظیم برطانیہ کے لیے میری تمام خدمات، شیخ محمد جیسے شخص کی جستجو اور اس پر اپنا اثر و نفوذ

قائم کرنے کے مقابلہ میں پاسنگ بھی نہیں۔ نوآبادیاتی علاقوں کے وزیر
کو جب اس بات کا علم ہوا کہ میں شیخ کی گمشدگی کے بارے میں بہت
پریشان ہوں تو اس نے نہایت اطمینان سے جواب دیا "پریشان
ہونے کی ضرورت نہیں۔ تم نے جو کچھ شیخ کو پڑھایا تھا وہ ابھی تک اسے
یاد ہے اور ہمارے آدمی اصفہان میں اس سے رابطہ قائم رکھے
ہوئے ہیں۔ ان کی رپورٹوں سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ ابھی تک اپنی
ڈگر پر قائم ہے۔ میں نے آپ ہی آپ کہا: شیخ نے اپنے اس غرور و
نخوت کے ساتھ انگریز جاسوس کو کیونکر اجازت دی ہو گی کہ وہ اس
کے بارے میں معلومات فراہم کر سکیں۔ اس موضوع پر وزیر سے بات
چیت کرتے ہوئے مجھے خوف محسوس ہوا کہ کہیں وہ برا نہ مان جائے۔
بعد میں شیخ سے دوبارہ ملاقات پر مجھے سب کچھ علم ہو گیا اور اس
نے تمام ماجرا کہہ سنایا۔ اس نے بتایا کہ اصفہان میں اس کی دوستی
عبدالکریم نامی ایک شخص سے ہوئی جو اپنے آپ کو اہل قلم
ظاہر کرتا تھا اور اسی نے شیخ پر اپنا سکہ بٹھا کر اس کے تمام راز معلوم
کیے تھے۔ اس کے ساتھ ہی صفیہ بھی کچھ عرصے بعد اصفہان آئی اور اس
نے مزید دو مہینے کے لیے شیخ سے متعہ کیا۔ شیراز کے سفر میں وہ اس کے
ساتھ نہیں تھی بلکہ عبدالکریم نے اسے اپنے ساتھ رکھا ہوا تھا۔ شیراز
میں عبدالکریم نے شیخ کے لیے صفیہ سے بھی زیادہ خوبصورت لڑکی
کا انتظام کیا تھا اور وہ شیراز کے ایک یہودی خاندان کی حسین و جمیل

لڑکی تھی جس کا نام آسیہ تھا۔ عبدالکریم اصفہان کے ایک مادر پدر آزاد عیسائی کا فرضی نام تھا اور وہ بھی آسیہ کی طرح ایران میں برطانیہ کے نوآبادیاتی علاقوں کی وزارت کا ایک قدیم ملازم تھا۔

مختصر یہ کہ عبدالکریم، صفیہ، آسیہ اور راقم الحروف نے مل کر اپنی رات دن کی کوششوں سے شیخ محمد بن عبدالوہاب کو نوآبادیاتی علاقوں کی وزارت کی خواہشات کے عین مطابق ڈھالا اور آئندہ کی پلاننگ کو روبہ عمل لانے کی ذمہ داری اٹھانے پر آمادہ کیا۔ یہاں یہ نکتہ بھی قابل ذکر ہے کہ وزیر سے ملاقات کے موقع پر سیکرٹری کے علاوہ وزارت کے دو اور اعلیٰ عہدہ دار بھی وہاں موجود تھے جنہیں اس وقت تک میں نہیں جانتا تھا۔ وزیر نے اجلاس کے اختتام پر مجھ سے کہا: "اب تم انگلستان کی نوآبادیاتی وزارت کے سب سے بڑے افتخاری نشان کے حقدار ہو اور یہ وہ اعزاز ہے جسے ہماری حکومت صفِ اول کے جاسوس کو دیا کرتی ہے۔" خدا حافظی کے موقع پر اس نے قطعی انداز میں کہا: "میں نے سیکرٹری سے کہہ دیا ہے کہ وہ تمہیں حکومت کے بعض "پوشیدہ" اور "رازدارانہ" مسائل سے آگاہ کرے تاکہ تم اپنی ذمہ داریوں کو زیادہ بہتر طریقے سے انجام دے سکو۔"

وزیر کی خوشنودی کے سبب میری دس دن کی چھٹی منظور ہوئی اور مجھے اپنی بیوی اور ایک عدد بچے سے ملنے کا موقع ہاتھ آیا۔ میرا لڑکا جو اب تین سال کا ہو چکا تھا، بالکل میرا ہم شکل تھا اور بعض الفاظ بڑے

میٹھے انداز میں بولنے لگا تھا۔ اس نے چلنا بھی سیکھ لیا تھا۔ میں حقیقتاً اپنے دل کے ٹکڑے کو زمین پر چلتا پھرتا محسوس کر رہا تھا۔ افسوس کہ خوشی کے یہ لمحات بڑی تیزی سے گزر رہے تھے۔ بیوی اور بچے کے ساتھ گزرنے والے یہ پُرمسرت لمحات واقعی ناقابل بیان ہیں اور زندگی کی تمام لذتیں اس کے آگے ہیچ ہیں۔ میری ایک عمر رسیدہ چچی تھی جس کی مجھ پر بچپن ہی سے نوازشات اور مہربانیاں رہی ہیں۔ میں اس سے مل کر کس قدر خوش ہوا، اس کا اندازہ کسی کو نہیں ہو سکتا۔ میری اس سے یہ آخری ملاقات تھی اس لیے کہ دس دن کی چھٹیوں کے بعد جب میں تیسری مرتبہ اپنے سفر پر روانہ ہوا تو نہایت افسوس کے ساتھ مجھے اس کی موت کی اطلاع ملی۔

میری دس دن کی یہ چھٹیاں پلک جھپکتے گزر گئیں۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ زندگی کے پرمسرت لمحات ہمیشہ بڑی تیزی سے گزرتے ہیں اور مصیبت کی گھڑیاں اپنے دامن میں سالوں کا فاصلہ رکھتی ہیں۔ لندن کے پرمسرت لمحات میں، میں نے اپنی نجف کی بیماری کو یاد کیا جس کا ہر لمحہ میرے لیے ایک صدی بن گیا تھا۔ میں کسی طرح بھی مصیبت کے ان ایام کو بھلا نہیں سکتا۔ خوشی کے لمحات کو اتنا دوام نہیں کہ وہ مصیبتوں کے دنوں کی کوفت کو یادوں کے دریچوں میں نہ آنے دیں۔

دس دنوں کی چھٹیاں منانے کے بعد آئندہ کے لائحہ عمل سے باخبر ہونے کے لیے میں بادلِ ناخواستہ وزارت خزانہ گیا۔ سیکریٹری

سے ملاقات کے موقع پر میں نے اسے ہمیشہ کی طرح خوش و خرم پایا۔ اس نے مجھ سے بڑی گرمجوشی کے ساتھ ہاتھ ملایا اور دوستانہ لہجہ میں کہا:

نوآبادیاتی امور کے خصوصی کمیشن کی مرضی کے مطابق وزیر نے خود مجھے یہ حکم دیا ہے کہ میں تمہیں دو اہم رموز سے آشنا کروں۔ ان رموز سے واقفیت آئندہ کے پروگراموں میں تمہارے لیے بہت مفید ثابت ہو گی اور ان دو باتوں سے نوآبادیاتی علاقوں کی وزارت کے صرف چند ایک ممبران ہی باخبر ہیں۔ یہ کہہ کر اس نے میرا ہاتھ تھاما اور اپنے ساتھ وزارت خانہ کے ایک کمرے میں لے گیا جہاں کچھ لوگ ایک گول میز کے اطراف بیٹھے ہوئے تھے۔ انھیں دیکھ کر تعجب سے میری چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی کیونکہ اس اجلاس کے آدمیوں کی کیفیت کچھ یوں تھی۔

۱۔ ہو بہو سلطنت عثمانی کا جلالت افروز پیکر جو ترکی اور انگریزی زبانوں پر بڑی مہارت سے مسلط تھا۔
۲۔ قسطنطنیہ کے شیخ الاسلام کی دوسری حقیقت سے قریب تصویر۔
۳۔ شہنشاہ ایران کا زندہ مجسمہ۔
۴۔ دربار ایران کے شیعہ عالم کی مکمل شبیہ۔
۵۔ نجف میں شیعوں کے مرجع تقلید کا بے مثل سراپا۔

یہ آخری تین افرد فارسی اور انگریزی زبانوں میں گفتگو کر رہے تھے۔ سب کے نزدیک ان کے پرائیویٹ سیکریٹری بیٹھے ہوئے تھے جو ان کی باتوں کا نوٹ بنا کر حاضرین کے لیے اس کا ترجمہ پیش کر رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان تمام پرائیویٹ سیکریٹریوں کا کسی زمانے میں مذکورہ پانچ شخصیتوں سے بہت قریب کا رابطہ رہ چکا تھا اور ان کی مکمل رپورٹ کے تحت ان پانچ ہم شبیہہ افراد کو بعینہٖ تمام عادات و خصائل کے ساتھ ظاہری اور باطنی اعتبار سے اصلی افراد کی مکمل تصویر بنایا گیا تھا۔ یہ پانچوں سوانگی اپنے فرائض اور مقام و منصب سے بخوبی آشنا تھے۔ سیکریٹری نے آغاز سخن کرتے ہوئے کہا: ان پانچ افراد نے اصلی شخصیتوں کا بہروپ بھر رکھا ہے اور یہ بتانا چاہتے ہیں کہ وہ کس طرح کی سوچ رکھتے ہیں اور آئندہ کے بارے میں ان کا کیا خیال ہے۔ ہم نے استنبول، تہران اور نجف کی مکمل اطلاعات انھیں فراہم کر دی ہیں۔ اب وہ اپنی ہیئت کذائی کو حقیقت پر محمول کیے بیٹھے ہیں اور اسی احساس کے ساتھ اپنی حاصل کردہ معلومات سے ہمارے سوالوں کا جواب فراہم کرتے ہیں۔ ہماری جانچ پڑتال کے مطابق ان کے ستّر فیصد جوابات حقیقت کے عین مطابق یا یوں کہیے کہ اصلی شخصیتوں کے افکار سے ہم آہنگ ہوتے ہیں۔ سیکریٹری نے اپنی گفتگو کے دوران مجھے مخاطب کر کے کہا: ”اگر تم چاہو تو ان میں سے کسی کا امتحان لے سکتے ہو۔ مثال کے طور پر نجف کے شیعہ مرجع تقلید سے جو چاہو پوچھ سکتے ہو۔“

میں نے کہا: "بہت اچھا" اور فوراً ہی کچھ سوالات پوچھ ڈالے۔

میرا پہلا سوال یہ تھا: "قبلہ وکعبہ! کیا آپ اپنے مقلّدین کو اس بات کی اجازت دیتے ہیں کہ وہ سنی اور متعصب عثمانی حکومت کی مخالفت پر کمر بستہ ہوں اور ان کے خلاف اعلان جنگ کریں؟"

نقلی یا سوانگی مرجع تقلید نے کچھ دیر سوچا اور کہا: "میں مطلق جنگ کی اجازت نہیں دیتا کیونکہ وہ سنی مسلمان ہیں اور قرآن کی آیت کہتی ہے کہ 'تمام مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں' صرف اس صورت میں جنگ جائز ہے جب عثمانی حکمران ظلم وستم پر اتر آئیں۔ ایسی حالت میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے تحت ان سے جنگ لڑی جا سکتی ہے۔ وہ بھی اس وقت تک جب آثار ظلم زائل نہ ہو جائیں اور ظالم ظلم سے باز نہ آ جائے۔"

میں نے پھر دوسرا سوال پوچھا: "حضور والا! یہودیوں اور عیسائیوں کی نجاست کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ کیا یہ لوگ واقعی ناپاک ہیں؟"

اس نے کہا: "ہاں، یہ دونوں فرقے مسلماً نجس ہیں اور مسلمانوں کو ان سے دُور رہنا چاہیے۔"

میں نے پوچھا: "اس کی وجہ کیا ہے؟"

اس نے جواب دیا: "یہ دراصل مساویانہ سلوک کا مسئلہ ہے کیونکہ وہ لوگ بھی ہمیں کافر گردانتے ہیں اور ہمارے پیغمبرؐ کی

تکذیب کرتے ہیں"

اس کے بعد میں نے پوچھا: "پیغمبر اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی صفائی سے متعلق اتنی تاکیدات کے بعد کہ صفائی ایمان کی علامت ہے، پھر کیوں حضرت علیؑ کے صحن مطہر اور تمام بازاروں میں اس قدر گندگی پھیلی رہتی ہے؟"

مرجع تقلید نے جواب دیا: "بے شک اسلام نے صفائی اور ستھرائی کو ایمان کی دلیل جانا ہے مگر اس کو کیا کیا جائے کہ عثمانی حکومت کے عمال کی بے توجہی اور پانی کی قلت نے یہ صورت پیدا کی ہے"

دلچسپ بات یہ تھی کہ اس بناوٹی مرجع تقلید کی آمادگی اور حاضر جوابی نجف کے حقیقی مرجع تقلید کے عین مطابق تھی۔ فقط عثمانی حکومت کے عمال کی بے توجہی کی بات اس نے اپنی طرف سے اس میں ملائی تھی کیونکہ نجف کے عالم کی زبان سے یہ جملہ نہیں سنا گیا تھا۔ بہرحال میں اس ہم آہنگی اور مشابہت پر سخت متحیر تھا کیونکہ تمام جوابات بعینہٖ اصل مرجع تقلید کے بیانات تھے جسے اس نے فارسی میں پیش کیا تھا اور یہ نقلی مرجع بھی فارسی ہی میں گفتگو کر رہا تھا۔

سیکریٹری نے مجھ سے کہا: "دیگر چار افراد سے بھی چاہو تو سوال کر سکتے ہو۔ یہ چاروں افراد بھی تمہیں اصلی شخصیتوں کی طرح جواب

دبں گئے"

میں نے کہا کہ میں استنبول کے شیخ الاسلام احمد آفندی کے افکار اور بیانات سے بخوبی واقف ہوں اور اس کی باتیں میرے حافظے میں محفوظ ہیں۔ آپ کی اجازت سے میں اس کے ہم شکل سے گفتگو کروں گا۔ اس کے بعد میں نے پوچھا: "آفندی صاحب! کیا عثمانی خلیفہ کی اطاعت واجب ہے؟"

اس نے کہا: "ہاں میرے بیٹے! اس کی اطاعت، خدا اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کی طرح واجب ہے۔"

میں نے پوچھا: "کس دلیل کی بنیاد پر؟"

اس نے جواب دیا: "کیا تم نے یہ آیت کریمہ نہیں سنی ہے کہ: "خدا، اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور اولی الامر کی اطاعت کرو۔" [1]

میں نے کہا: "اگر ہر خلیفہ اولی الامر ہے تو گویا خدا نے ہمیں یزید کی اطاعت کا بھی حکم دیا ہے کیونکہ وہ اس وقت کا خلیفہ تھا درآنحالیکہ اس نے مدینہ کی تاراجی کا حکم دیا تھا اور سبطِ رسولؐ حضرت امام حسینؑ کو قتل کیا تھا۔ خداوند علیم کس طرح ولید کی اطاعت کا حکم دے گا جبکہ وہ شراب خور تھا۔"

---

[1] اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِى الْاَمْرِ مِنْكُمْ (سورۂ نساء آیت ۵۹)

نقلی شیخ الاسلام نے جواب دیا: "میرے بچے! یزید اللہ کی طرف سے مومنوں کا امیر تھا لیکن قتلِ حسینؓ میں اس سے خطا ہو گئی تھی جس کے لیے بعد میں اس نے توبہ کر لی تھی۔ مدینہ میں قتل و غارتگری کا سبب وہاں کے لوگوں کی سرکشی اور یزید کی اطاعت سے انحراف تھا جس میں یزید کا کوئی قصور نہیں تھا۔ اب رہ گیا ولید تو اس میں شک نہیں کہ وہ شراب پیتا تھا لیکن شراب میں پانی ملا کر پیتا تھا تاکہ اس کی مستی ختم ہو جائے اور یہ اسلام میں جائز ہے"۔[1]

میں نے کچھ عرصہ قبل استنبول میں حرمتِ شراب سے متعلق مسئلہ کو وہاں کے شیخ الاسلام شیخ احمد سے دریافت کر لیا تھا۔ اس کا جواب تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ لندن کے اس نقلی شیخ الاسلام کے جواب سے ملتا جلتا تھا۔ میں نے اصل سے نقل کی ایسی شباہت تیار کرنے کی کوششوں کو سراہتے ہوئے سیکریٹری سے پوچھا: "آخر اس کام سے کیا فائدہ حاصل ہو سکتا ہے؟"

اس نے جواب دیا: "اس طرح ہم بادشاہوں اور سنی شیعہ علماء کے افکار اور ان کے میلانِ طبع سے آشنائی حاصل کرتے ہیں۔ پھر ان مکالمات کو پرکھا جاتا ہے اور ان سے نتائج اخذ کیے جاتے ہیں اور پھر ہم علاقے کے دینی اور سیاسی مسائل میں دخل اندازی کرتے

---

[1] شراب خوری اسلام میں مطلقاً حرام ہے اور یہ حرمت کسی شرط سے نہیں ٹوٹتی۔

ہیں مثلاً اگر ہمیں یہ معلوم ہو جائے کہ فلاں عالم یا فلاں بادشاہ علاقہ کی مشرقی سرحدوں میں ہم سے مخاصمت پر اتر آیا ہے تو ہم اس کے عمل کو ناکارہ بنانے کے لیے ہر طرف سے اپنی توانائیوں کو اس سمت میں مرکوز کر دیتے ہیں لیکن اگر ہمیں یہ نہ معلوم ہو کہ ہمارا حقیقی دشمن کس مقام پر سرگرم عمل ہے تو پھر ہمیں اپنی توانائیوں کو علاقہ کے چپے چپے میں پھیلانا پڑتا ہے۔ مذکورہ عمل ہمیں اس بات میں بھی مدد دیتا ہے کہ ہم اسلام کے احکام و فرامین سے ایک فرد مسلم کے طرز استنباط کو سمجھیں اور اس کے ذہن میں شک اور تذبذب پیدا کرنے کے لیے زیادہ واضح اور زیادہ منطقی مطالب فراہم کریں اور اس کے عقائد کو باطل قرار دیں۔ اختلافات، تفرقے، گڑبڑ اور مسلمانوں کے عقائد میں تزلزل پیدا کرنے کے لیے اس طرح کے اقدامات بے انتہا مؤثر پائے جاتے ہیں۔ اس کے بعد سیکریٹری نے مجھے ایک ہزار صفحوں پر مشتمل ایک ضخیم کتاب مطالعہ کے لیے دی۔ اس کتاب میں اصلی اور نقلی افراد کی گفتگو اور مناقشات کے تجزیہ اور مقابلوں کے نتائج سے متعلق اعداد و شمار درج تھے اور مجھے حاصل شدہ نتائج کی بنیاد پر اسلامی دنیا میں فوجی، مالی، تعلیمی اور مذہبی مسائل سے متعلق حکومت برطانیہ کے مرتب شدہ پروگراموں سے واقفیت حاصل کرنا تھی۔ بہر حال میں کتاب گھر لے گیا اور تین ہفتے کے عرصے میں بڑی توجہ کے ساتھ شروع سے آخر تک اس کا مطالعہ کیا اور مقررہ مدت میں

نوآبادیاتی علاقوں کی وزارت کو واپس دے آیا۔ کتاب واقعی بڑی محنت سے تیار کی گئی تھی۔ اس میں صاحبان علم، صاحبان سیاست اور اسلام کی دینی شخصیتوں کے عقائد و نظریات کے بارے میں اس خوبی سے بحث کی گئی تھی اور نتیجہ اخذ کیا گیا تھا کہ پڑھنے والا دنگ رہ جاتا تھا۔ ستّر فیصد مباحث حقیقت پر منطبق تھے جبکہ ۳۰ فیصد میں اختلاف تھا۔ کتاب کے مطالعہ کے بعد مجھے اطمینان ہو گیا کہ میری حکومت یقیناً اپنے عمل میں کامیاب ہوگی اور مذکورہ کتاب کی پیشگوئی کے مطابق سلطنت عثمانی ایک صدی سے کم عرصے میں بہر حال ختم ہو جائیگی۔

سیکریٹری سے ملنے کے بعد مجھے یہ بات معلوم ہو گئی کہ نوآبادیاتی علاقوں کی وزارت میں دنیا کے تمام ممالک کے لیے خواہ وہ استعماری ہوں یا نیم استعماری اس طرح کی شبیہ سازی یا نقلی روپ کا عمل بروئے کار لایا گیا ہے اور ان تمام ممالک کو پوری طرح استعمار کے شکنجے میں جکڑنے کے انتظامات مکمل کیے گئے ہیں۔

سیکریٹری نے اپنی گفتگو کے دوران مجھ سے کہا تھا کہ یہ وہ پہلا راز ہے جسے اس نے وزیر کے حکم کے مطابق مجھے بتایا ہے مگر دوسرے راز کو وہ مذکورہ کتاب کی دوسری جلد کے مطالعہ پر ایک ماہ بعد مجھے بتائے گا۔

میں نے دوسری کتاب لے کر اس کا مطالعہ شروع کیا۔ یہ کتاب، پہلی کتاب کو مکمل کرتی تھی۔ اس میں اسلامی ممالک سے متعلق نئی اطلاعات

زندگی کے مختلف مسائل میں شیعہ سنی عقائد وافکار جو حکومت کی کمزوری یا توانائی کو ظاہر کرتے تھے اور مسلمانوں کی پسماندگی کے اسباب وعلل وغیرہ پر گفتگو تھی۔ اس کتاب میں ان موضوعات پر بڑی سیر حاصل بحث کی گئی تھی اور مسلمانوں کے کمزور پہلوؤں یا طاقت کے ذرائع کو نمایاں کیا گیا تھا اور ان سے اپنے حق میں فائدہ اٹھانے کی تدابیر سمجھائی گئی تھیں۔ اس کتاب میں مسلمانوں کی جن کمزوریوں کی طرف اشارہ کیا گیا تھا وہ یہ تھیں۔

۱۔ الف : شیعہ سنی اختلاف۔
ب : حکمرانوں کے ساتھ قوموں کے اختلافات۔
ج : ایرانی اور عثمانی حکومتوں کے اختلافات۔
د : قبائلی اختلافات۔
ہ : علماء اور حکومت کے عہدہ داروں کے درمیان غلط فہمیاں۔

۲۔ تقریباً تمام مسلمان ملکوں میں جہالت اور نادانی کی فراوانی۔

۳۔ فکری جمود اور تعصب، روزانہ کے حالات سے بے خبری، کام اور محنت کی کمی۔

۴۔ مادی زندگی سے بے توجہی، جنت کی امید میں حد سے زیادہ عبادت جو اس دنیا میں بہتر زندگی کے راستوں کو بند کر دیتی تھی۔

۵۔ خودسر فرمانرواؤں کے ظلم واستبداد۔

۶۔ امن وامان کا فقدان، شہروں کے درمیان سڑکوں اور راستوں

کا فقدان، علاج معالجے کی سہولتوں اور حفظانِ صحت کے اصولوں
کا فقدان جس کی بنا پر طاعون یا اس جیسی متعدی بیماریوں سے
ہر سال آبادی کا ایک حصہ موت کی نذر ہو جاتا۔

۸۔ شہروں کی ویرانی، آبپاشی کے نظام کا فقدان، زراعت اور کھیتی باڑی کی کمی۔

۹۔ حکومتی دفتروں میں بدانتظامی اور قاعدے قوانین کا فقدان، قرآن اور احکامِ شریعت کے احترام کے باوجود عملی طور پر اس سے بے توجہی۔

۱۰۔ پس ماندہ اور غیر صحت مندانہ اقتصاد۔ پورے علاقے میں عام غربت اور بیماری کا دور دورہ۔

۱۱۔ صحیح تربیت یافتہ فوجوں کا فقدان، اسلحہ اور دفاعی ساز و سامان کی کمی اور موجودہ اسلحوں کی فرسودگی۔

۱۲۔ عورتوں کی تحقیر اور ان کے حقوق کی پامالی۔

۱۳۔ شہروں اور دیہاتوں کی گندگی، ہر طرف کوڑے کرکٹ کے انبار، سڑکوں، شاہراہوں اور بازاروں میں اشیائے فروخت کے بے ہنگم ڈھیر، وغیرہ۔

مسلمانوں کے ان کمزور پہلوؤں کو گنوانے کے بعد کتاب نے اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ کیا تھا کہ شریعت اسلام کا قانون مسلمانوں کی اس طرزِ زندگی سے رتی برابر بھی میل نہیں کھاتا لیکن یہ بات ضروری ہے

کہ مسلمانوں کو اسلام کی حقیقی روح سے بے خبر رکھا جائے اور انھیں حقائقِ دین تک نہ پہنچنے دیا جائے۔ اس کے بعد کتاب نے بصورت فہرست ان اوامر و احکامات کی طرف بھی اشارہ کیا تھا جو دین اسلام کے اصول و مبانی کو ظاہر کرتے تھے اور ان کی صورت یہ تھی۔

۱- وحدت، دوستی اور بھائی چارہ کی تاکید اور تفرقہ سے دوری۔[1]

۲- تعلیم و تربیت کی تاکید۔[2]

۳- جستجو اور ابتکار کی تاکید۔[3]

۴- مادی زندگی کو بہتر بنانے کی تاکید۔[4]

۵- زندگی کے مسائل میں لوگوں سے رائے مشورے کی تاکید۔[5]

۶- شاہرائیں بنانے کی تاکید۔[6]

۷- حدیث نبوی ص کی بنیاد پر تندرستی اور معالجہ کی تاکید۔

علوم کی چار قسمیں ہیں:

---

[1] وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا وَّلَا تَفَرَّقُوا۔ (سورۂ آل عمران آیت ۱۰۳)

[2] طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيضَةٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ وَّمُسْلِمَةٍ۔

[3] فَسِيرُوا فِي الْاَرْضِ۔ (سورۂ آل عمران آیت ۱۳۷)

[4] رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً۔ (سورۂ بقرۃ آیت ۲۰۱)

[5] وَاَمْرُهُمْ شُورٰى بَيْنَهُمْ۔ (سورۂ شوریٰ آیت ۳۸)

[6] فَامْشُوا فِي مَنَاكِبِهَا۔ (سورۂ ملک آیت ۱۵)

ا: علم فقہ، دین کی حفاظت کے لیے۔

ب: علم طب، بدن کی حفاظت کے لیے

ج: علم نحو، زبان کی حفاظت کے لیے

د: علم نجوم، زمانے کی پہچان کے لیے[1]

۸۔ آبادکاری کی تاکید۔[2]

۹۔ اپنے کاموں میں نظم و ترتیب۔[3]

۱۰۔ معاشی استحکام کی تاکید۔[4]

۱۱۔ جدید ترین اسلحہ اور جنگی ساز و سامان سے لیس فوجی تنظیم کی تاکید۔[5]

۱۲۔ عورتوں کے حقوق کی حفاظت اور اس کے احترام کی تاکید۔[6]

---

[1] إِنَّمَا الْعُلُومُ أَرْبَعَةٌ: عِلْمُ الْفِقْهِ لِحِفْظِ الْأَدْيَانِ، وَعِلْمُ الطِّبِّ لِحِفْظِ الْأَبْدَانِ، وَعِلْمُ النَّحْوِ لِحِفْظِ اللِّسَانِ، وَعِلْمُ النُّجُومِ لِحِفْظِ الْأَزْمَانِ۔

[2] هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُمْ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا (سورۂ بقرہ آیت ۲۹)

[3] وَنَظْمِ أَمْرِكُمْ۔

[4] مَنْ لَا مَعَاشَ لَهُ لَا مَعَادَ لَهُ۔

[5] وَأَعِدُّوا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ (سورۂ انفال آیت ۶۰)

[6] وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ (سورۂ بقرہ آیت ۲۲۸)

۱۴۔ صفائی اور پاکیزگی کی تاکید[1]

ان اوامر کے تذکرہ کے بعد کتاب اپنے دوسرے باب میں اسلام کے طاقت و قوت کے سرچشموں اور مسلمانوں کی پیشرفت کے اسباب پر روشنی ڈالتی ہے اور انھیں تباہی سے دوچار کرنے کے لیے ترقی و تکامل کی راہوں کے خلاف اقدامات کو نوآبادیاتی علاقوں کی وزارت کا نقطہ آغاز قرار دیتی ہے اور وہ ترقی و تکامل کی راہیں یہ تھیں:

۱۔ رنگ و نسل، زبان، تہذیب و تمدن اور قومی تعصبات کو خاطر میں نہ لانا۔

۲۔ سود، ذخیرہ اندوزی، بدعملی، شراب اور سوّر کے گوشت وغیرہ کی ممانعت۔

۳۔ ایمان و عقیدہ کی بنیاد پر علمائے دین سے شدید محبت اور وابستگی۔

۴۔ موجودہ خلیفہ کی نسبت عامۃ المسلمین کا احترام اور یہ عقیدہ کہ وہ پیغمبرؐ کا جانشین اور اولی الامر ہے جس کی بنا پر اس کے احکامات کی بجاآوری خدا اور رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے احکامات کی بجاآوری ہے۔

۵۔ کفار کے خلاف وجوب جہاد۔

۶۔ غیر مسلموں کی ناپاکی پر مبنی اہل تشیع کا عقیدہ

---

[1] اَلنَّظَافَةُ مِنَ الْاِیْمَانِ۔

۷۔ تمام ادیان اور مذاہب پر اسلام کی بالادستی کا اعتقاد[1]
۸۔ اسلامی سرزمین پر یہودی اور نصرانی عبادت گاہوں کی تعمیر کے بارے میں شیعہ حضرات کی مخالفت۔
۹۔ جزیرۃ العرب سے تمام یہودیوں اور نصرانیوں کے انخلاء پر اکثر مسلمانوں کا اتفاق۔
۱۰۔ اشتیاق کے ساتھ نماز، روزہ اور حج کے فرائض کی انجام دہی میں مداومت۔
۱۱۔ خمس کی ادائیگی کے بارے میں اہل تشیع کا عقیدہ اور علماء کی طرف سے مستحقین کو اس رقم کی تقسیم۔
۱۲۔ ایمان و اخلاص کے ساتھ اسلام کے دینی عقائد سے دلچسپی۔
۱۳۔ گھریلو استحکام کے بنیادی مقصد کے ساتھ بچوں اور نوجوانوں کی روایتی تعلیم و تربیت اور بچوں کے ساتھ والدین کے دائمی ارتباط کی ضرورت و اہمیت کا رجحان۔
۱۴۔ عورتوں کو پردہ کی تاکید جو انھیں غیر شرعی روابط اور بدعملیوں سے روکتی ہے۔
۱۵۔ نماز جماعت کا استحباب اور ہر جگہ کے لوگوں کا دن میں کئی مرتبہ ایک مسجد میں اکٹھا ہونا۔

---

[1] اَلْإِسْلَامُ يَعْلُوْ وَلَا يُعْلٰى عَلَيْهِ۔

۱۶- پیغمبر اکرمؐ، اہلبیتؑ، علماء اور صلحاء کی زیارت گاہوں کی تعظیم اور ان مقامات کو ملاقات اور اجتماع کے مراکز قرار دینا۔

۱۷- سادات کا احترام اور رسولِ اکرمؐ کا اس طرح تذکرہ کرنا گویا وہ ابھی زندہ ہیں اور درود و سلام کے مستحق ہیں۔

۱۸- شیعوں کی طرف سے عزاداری کا انعقاد خاص طور پر محرم اور صفر کے عظیم اجتماعات اور ان میں علماء و ذاکرین کی منظم تقریریں جو یقیناً مسلمانوں کے ایمانی استحکام میں ایک ناقابل انکار اثر چھوڑ جاتی ہیں اور انھیں نیک چال چلن پر ابھارتی ہیں۔

۱۹- اسلام کے اہم اصولوں کے عنوان سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا وجوب۔

۲۰- شادی بیاہ، کثرت اولاد اور تعددِ ازواج کا مستحب ہونا۔

۲۱- کافروں کی ہدایت پر اتنا زور کہ اگر کوئی کسی کافر کو مسلمان کرے تو یہ کام اس کے لیے تمام دنیا کی دولت سے مفید ہوگا۔

۲۲- نیک عمل انجام دینے کی اہمیت: "جو کوئی کسی نیک عمل کی پیروی کرے گا اس کے لیے دو جزائیں مخصوص ہیں۔ ایک خود اس نیک عمل کی اپنی جزا اور دوسرے اس نیک عمل کو انجام دینے کی جزا۔"[1]

---

[1] مَنْ سَنَّ سُنَّةً حَسَنَةً كَانَ لَهُ اَجْرُهَا وَاَجْرُ مَنْ عَمِلَ بِهَا ۔

۲۳۔ قرآن وحدیث کا بے انتہا پاس و احترام اور ثواب آخرت کے لیے ان پر عمل پیرا ہونے کی شدید ضرورت۔

اسلام کے ان سرچشمہ ہائے قوت کے تذکرہ کے بعد کتاب کے اگلے ابواب میں دیانت کے ان محکم ستونوں کو کمزور بنانے کے عملی اسلوب پر بڑی محکم دلیلوں کے ساتھ گفتگو کی گئی تھی۔ اس کے بعد بصورت فہرست ان اقدامات کی تاکید تھی جن کے ذریعے اسلامی دنیا کو کمزور بنایا جا سکتا تھا اور وہ یہ تھیں:

۱۔ بدگمانی اور سوءِ تفاہم کے ذریعے شیعہ اور سنی مسلمانوں میں مذہبی اختلافات پیدا کرنا اور دونوں گروہوں کی طرف سے ایک دوسرے کے خلاف اہانت آمیز اور تہمت انگیز باتیں لکھنا اور نفاق و تفرقہ کے اس سودمند پروگرام کو روبہ عمل لانے کے لیے بھاری اخراجات کی ہرگز پروا نہ کرنا۔

۲۔ مسلمانوں کو جہالت اور لاعلمی کے عالم میں رکھنا۔ کسی تعلیمی مرکز کے قیام کی کوشش کو کامیاب نہ ہونے دینا۔ طباعت اور نشرواشاعت پر پابندی عائد کرنا اور ضرورت پڑے تو عوامی کتاب خانوں کو نذرِ آتش کرنا۔ بچوں کو دینی مدارس میں جانے سے روکنے کے لیے علماء اور مراجع دینی پر تہمتیں لگانا۔

۳۔ کاہلی پھیلانے اور زندگی کی جستجو سے مسلمانوں کو محروم کرنے کے لیے موت کے بعد کی دنیا میں رنگ آمیزی اور جنت کی ایسی توصیف

بیان کرتا کہ وہ مجسم بن کر لوگوں کے ذہن وقلب پر چھا جائے اور وہ اس کو حاصل کرنے کے لیے اپنی معاشی تگ و دو سے دستبردار ہو جائیں اور ملک الموت کے انتظار میں بیٹھے رہیں۔

۴۔ ہر طرف درویشوں کی خانقاہوں کا پھیلاؤ اور ایسی کتابوں اور رسالوں کی طباعت جو لوگوں کو دنیا و ما فیہا سے برگشتہ کر کے انھیں مردم بیزاری اور گوشہ نشینی کی طرف مائل کریں جیسے غزالی کی احیاء العلوم، مولانا روم کی مثنوی اور محی الدین عربی کی کتابیں وغیرہ[1]

۵۔ مستبد اور خود خواہ حکمرانوں کی حقانیت کے ثبوت میں مختلف احادیث کی اشاعت مثلاً: "بادشاہ زمین پر اللہ کا سایہ ہے"[2] یا پھر یہ دعویٰ کہ حضرت ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ اور علیؑ، بنی امیہ اور بنی عباس سب کے سب بالجبر تلوار کے زور سے حکومت کے منصب پر فائز ہوئے اور بزور شمشیر حکمرانی کی یا سقیفہ کی

---

[1] ان کتابوں کے بارے میں لکھنے والے کا فیصلہ بے علمی یا بدنیتی پر مبنی ہے۔ غزالی جیسے متکلمین یا محی الدین عربی اور مولانا جلال الدین رومی جیسے عرفاء کی بیان کردہ تعلیمات عملی اخلاق کا ایک سلسلہ ہے۔ نفس کے تزکیہ و تہذیب کو گوشہ نشینی اور مردم بیزاری سے تعبیر کرنا قطعاً درست نہیں۔

[2] اَلسُّلْطَانُ ظِلُّ اللّٰهِ فِي الْاَرْضِ۔

کارروائی کو ایک تماشے کی صورت میں پیش کرنا جس کی ڈوری حضرت عمر نے تھام رکھی ہو اور اس بارے میں دلائل قائم کرنا جیسے حضرت علی (علیہ السلام) کے طرفداروں خاص طور پر آپ کی زوجہ حضرت فاطمہ زہرا (علیہا السلام) کا گھر جلانا نیز یہ ثابت کرنا کہ :

(۱) حضرت عمر کی خلافت، ظاہراً حضرت ابوبکر کی وصیت اور باطناً مخالفین کو ڈرا دھمکا کر عمل میں آئی۔

(۲) حضرت علی (علیہ السلام) کی مخالفت کی بنیاد پر حضرت عثمان کے انتخاب میں ایک ڈرامائی شوریٰ کی تشکیل، جو بالآخر مخالفت، شورش، خلیفہ سوم کے قتل اور حضرت علیؑ کی خلافت پر منتج ہوئی۔

(۳) مکر و حیلہ اور شمشیر کے ذریعے معاویہ کا برسر اقتدار آنا اور اسی صورت میں اس کے جانشینوں کا استقرار۔

(۴) ابومسلم کی قیادت میں سفاح کی مسلح شورش اور بزور شمشیر خلافت بنی عباس کا قیام۔

(۵) حضرت ابوبکر سے لے کر عثمانیوں کی حکمرانی کے اس دور تک تمام خلفائے اسلام آمر تھے اور یہ کہ

(۶) نظام اسلام میں ہمیشہ آمریت کا دور دورہ رہا ہے۔

۶ ۔ راستوں میں بدامنی کے اسباب فراہم کرنا۔ بداندیش افراد کی مدد سے شہروں اور دیہاتوں میں فتنہ و فساد برپا کرنا اور غنڈوں

فسادیوں اور ڈاکوؤں کی پشت پناہی کرنا اور انھیں اسلحہ اور رقم فراہم کرکے ان کی تشویق کرنا۔

۷۔ حفظانِ صحت کی کوششوں کے آڑے آنا اور جبری اور قدری افکار کو ترجیح دینا اور یہ بتانا کہ ہر چیز اللہ کی طرف سے ہے۔ بیماری بھی اللہ کی دین ہے اور اس کا علاج بے سود ہے۔ اس سلسلے میں یہ آیت پیش کرنا: "وہی ہے جو مجھے کھانا دیتا ہے اور پیاس کی حالت میں سیراب کرتا ہے اور جب میں بیمار ہوتا ہوں تو مجھے تندرستی عطا کرتا ہے۔"[۱] "وہی مارتا ہے اور جلاتا بھی ہے۔"[۲] شفاء اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ موت اور حیات بھی اس کے قبضۂ قدرت میں ہیں۔ بیماری سے شفایابی اور موت سے رہائی اس کی مشیت اور اس کے ارادہ کے بغیر قطعی ناممکن ہے اور یہ تمام رونما ہونیوالے واقعات قضائے الٰہی ہیں۔

۸۔ اسلامی ممالک کو فقر و فلاکت میں باقی رکھنا اور ان میں کسی قسم کا تغیر و تبدل یا اصلاح عمل کو جاری نہ ہونے دینا۔

۹۔ فتنہ و فساد اور ہنگامہ آرائیوں کو ہوا دینا اور اس عقیدہ کو لوگوں میں راسخ کرنا کہ اسلام محض عبادت اور پرہیزگاری کا نام ہے

۱؎ وَإِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِينِ (سورہ شعراء آیت ۸۰)

۲؎ وَالَّذِي يُمِيتُنِي ثُمَّ يُحْيِينِ (سورہ شعراء آیت ۸۱)

اور دنیا اور اس کے امور سے اس کا کوئی واسطہ نہیں۔ حضرت ختمی مرتبت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور ان کے جانشینوں نے کبھی ان مسائل میں پڑنے کی کوشش نہیں کی اور سیاسی اور اقتصادی تنظیم سے کوئی سروکار نہیں رکھا۔

۱۰۔ اوپر دیے ہوئے امور پر توجہ اقتصادی بدحالی اور غربت و بیکاری میں اضافہ کا باعث ہوگی مگر اس کے ساتھ ساتھ پسماندگی میں اضافہ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ کسانوں کے غلّہ کے ڈھیروں کو نذرِ آتش کیا جائے، تجارتی کشتیاں ڈبو دی جائیں، تجارتی جہاز اور صنعتی مراکز میں بڑے پیمانے پر آگ بھڑکائی جائے۔ دریاؤں کے بند توڑ کر بستیاں ویران کی جائیں اور پینے کے پانی کو زہر آلود بنایا جائے تاکہ اس لحاظ سے علاقے والوں کی پسماندگی اور فقر و فلاکت کا سامان فراہم کیا جا سکے۔

۱۱۔ اسلامی حکمرانوں کے مزاج کو بدلا جائے اور ان میں شراب نوشی، جوئے بازی اور دیگر اخلاقی برائیاں پیدا کی جائیں۔ قومی خزانہ میں خورد برد اور لوٹ کھسوٹ کی ایسی صورت پیدا کی جائے کہ ان کے پاس اپنے دفاع، ملکی معیشت اور ترقیاتی امور کے لیے کوئی رقم باقی نہ رہے۔

۱۲۔ "مرد عورتوں پر حاکم ہیں"[1] کی آیت یا "عورتیں بدی کا پتلا ہیں"[2]

---

[1] اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ (سورۂ نساء آیت ۳۴) [2] اَلْمَرْأَةُ شَرٌّ كُلُّهَا۔

کی حدیث کے سہارے عورتوں کی توہین و تحقیر اور کینزی کا پرچار کیا جائے۔

۱۴۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلمانوں کی شہری اور دیہاتی بستیوں میں غلاظت اور گندگی کا سب سے بڑا سبب ان علاقوں میں پانی کی کمی ہے اور ہمیں چاہیے کہ ہم ہر ممکن طریقے سے گنجان آباد علاقوں میں پانی کی فراوانی روک دیں تاکہ ان علاقوں میں زیادہ کثرت سے گندگی میں اضافہ ہو۔

کتاب کے ایک اور باب میں مسلمانوں کی قوت وطاقت کو توڑنے اور انھیں کمزور بنانے کے دیگر اصولوں پر بھی گفتگو کی گئی تھی جو دلچسپی سے خالی نہیں:

۱۔ ایسے افکار کی ترویج جو قومی، قبائلی اور نسلی عصبیتوں کو ہوا دیں اور لوگوں کو گزشتہ قوموں کی تاریخ، زبان اور ثقافت کی طرف شدت سے مائل کریں اور وہ ماقبل اسلام کی تاریخی شخصیتوں پر فریفتہ ہو جائیں اور ان کا احترام کریں مصر میں فرعونیت کا احیاء، ایران میں دین زردشت اور بین النہرین میں بابل کی بت پرستی ان ہی کی مثالیں ہیں۔ کتاب کے اس حصے میں ایک بڑے نقشے کا بھی اضافہ کیا گیا تھا جس میں ان مراکز کی نشان دہی کی گئی تھی جن میں سابق الذکر خطوط پر عملدرآمد ہو رہا تھا۔

۲۔ شراب خوری، جوئے بازی، بدفعلی اور شہوت رانی کی ترویج سور کے گوشت کے استعمال کی ترغیب، ان کارگزاریوں میں یہودی، نصرانی، زردشتی اور صابئی اقلیتوں کو ایک دوسرے کے ساتھ ہاتھ بٹانا چاہیے اور ان برائیوں کو مسلم معاشرے میں زیادہ سے زیادہ فروغ دینا چاہیے جن کے عوض نوآبادیاتی علاقوں کی وزارت انھیں انعام واکرام سے نوازے گی۔ اس کام کے لیے متعدد افراد کی ضرورت ہے جو کسی بھی موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دیں اور شراب، جوا، فحشاء اور سور کے گوشت کو جہاں تک ہو سکے لوگوں میں مقبول بنائیں۔ اسلامی دنیا میں انگریزی حکومت کے کارندوں کا یہ فریضہ تھا کہ وہ مال و دولت انعام واکرام اور ہر مناسب طریقے سے ان برائیوں کی پشت پناہی کریں اور ان پر عامل افراد کو کسی طرح کا گزند نہ پہنچنے دیں اور مسلمانوں کو اسلامی احکامات اور اس کے اوامر و نواہی سے روگردانی کی ترغیب دیں کیونکہ احکام شرع سے بے توجہی معاشرے میں بدنظمی اور افراتفری کا سبب ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر قرآن مجید میں سود کی شدت سے مذمت کی گئی ہے اور اس کا شمار گناہان کبیرہ میں ہوتا ہے۔ پس لازم ہے کہ ہر حال میں سود اور حرام سودے بازی کو عام کرنے کی کوشش کی جائے اور اقتصادی بدحالی کو مکمل طور پر مضمحل بنایا جائے۔

اس کام کے لیے ضروری ہے کہ سود کی تحریم سے متعلق آیات کی غلط تفسیر کی جائے اور اس اصول کو پیش نظر رکھا جائے کہ قرآن کے ایک حکم سے سرتابی اسلام کے تمام احکام سے روگردانی کی جرأت کا آئینہ دار ہوتی ہے۔ مسلمانوں کو یہ سمجھانے کی ضرورت ہے کہ قرآن نے جس سود کو منع کیا ہے وہ سود مرکب (یا سود در سود) ہے وگرنہ عام سود میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ قرآن کہتا ہے "اپنے مال کو کئی گنا کرنے کی خاطر سود نہ کھاؤ" [1]
اس بنا پر عام حالت میں سود حرام نہیں ہے۔

۴-۳۔ علمائے دین اور عوام کے درمیان دوستی اور احترام کی فضا کو آلودہ کرنا وہ اہم فریضہ ہے جسے انگلستان کی حکومت کے ہر ملازم کو یاد رکھنا چاہیے۔ اس کام کے لیے دو باتوں کی اشد ضرورت ہے:

ا۔ علماء و مراجع پر الزام تراشی کرنا۔

ب۔ نوآبادیاتی علاقوں کی وزارت سے منسلک بعض افراد کو علمائے دین کی صورت دینا اور انہیں الازہر یونیورسٹی، نجف، کربلا اور استنبول کے علمی اور دینی مراکز میں اتارنا، علمائے دین سے لوگوں کا رشتہ توڑنے کے لیے ایک راستا

---

[1] لَا تَأْكُلُوا الرِّبٰوٓا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً (سورہ آل عمران آیت ۱۳۰)

یہ بھی ہے کہ بچوں کو نوآبادیاتی علاقوں کی وزارت کے پروگراموں کے مطابق تربیت دی جائے۔ اس کام کے لیے ایسے اساتذہ کی ضرورت ہے جو ہمارے تنخواہ دار ہوں تاکہ وہ جدید علوم کی تدریس کے ضمن میں نوجوانوں کو علمائے دین اور عثمانی خلیفہ سے متنفر کریں اور ان کی اخلاقی برائیوں اور ظلم و زیادتیوں کو بڑی آب و تاب کے ساتھ بیان کریں اور یہ بتائیں کہ وہ کس طرح قومی سرمایہ کو اپنی عیاشیوں کی نذر کرتے ہیں اور ان میں کسی پہلو سے اسلامی جھلک نہیں پائی جاتی۔

۵۔ وجوبِ جہاد کے عقیدے میں تزلزل پیدا کرنا اور یہ ثابت کرنا کہ جہاد صرف صدر اسلام کے لیے تھا تاکہ مخالفوں کی سرکوبی کی جائے مگر آج اس کی قطعاً ضرورت نہیں ہے۔

۶۔ کافروں کی پلیدی اور نجاست سے متعلق موضوع جو خاص طور پر شیعہ حضرات کا عقیدہ ہے، ان مسائل میں سے ہے جسے مسلمانوں کے ذہن سے خارج ہونا چاہیے اور اس کے لیے قرآن اور حدیث سے مدد لینے کی ضرورت ہے۔ مثال کے طور پر یہ آیت جس میں کہا گیا ہے کہ "اہل کتاب جو کھانا کھاتے ہیں وہ تم پر حلال ہے اور جو تم کھاتے ہو وہ ان پر حلال ہے اور پاک دامن مومن عورتیں اور پاکدامن اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) عورتیں تم پر

حلال ہیں"۔[1] کیا رسولِ خدا (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے صفیہ اور ماریہ نامی یہودی اور مسیحی عورتوں سے شادی نہیں کی تھی؟ اور کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ (نعوذ باللہ) رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بیویاں نجس تھیں؟

۷۔ مسلمانوں کو یہ بات سمجھانی چاہیے کہ دین سے حضرت ختمی مرتبت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی مراد صرف اسلام نہیں بلکہ جیسا کہ قرآن حکیم سے بھی ثابت ہے دین میں اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ بھی شامل ہیں اور تمام ادیان کے پیروکاروں کو مسلمان کہا جائے گا۔ قرآن مجید میں حضرت یوسف (علیہ السلام) خدا سے دعا کرتے ہیں کہ اس دنیا سے مسلمان جائیں[2] حضرت ابراہیم و اسماعیل (علیہما السلام) کی بھی یہی تمنا ہے کہ "پروردگار ہم دونوں کو مسلمانوں کے زمرہ میں اور ہمارے خاندان کو امت مسلمہ قرار دے[3]"۔ حضرت یعقوب (علیہ السلام) اپنے فرزندوں سے کہتے ہیں: "نہ مرنا مگر

---

[1] وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ الْمُؤْمِنَاتِ وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِن قَبْلِكُمْ۔
(سورۂ مائدہ آیت ۵)

[2] تَوَفَّنِي مُسْلِمًا۔ (سورۂ یوسف آیت ۱۲)

[3] رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِن ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ (سورۂ بقرہ آیت ۱۲۸)

حالتِ اسلام میں"[1]

۸۔ دوسرا اہم موضوع کلیساؤں اور کنیساؤں کی تعمیرات کے اسباب سے متعلق ہے۔ قرآن، حدیث اور تاریخِ اسلام کی روشنی میں لوگوں کو یہ باور کرایا جائے کہ اہلِ کتاب کی عبادت گاہیں محترم ہیں۔ قرآن کا ارشاد ہے: "اگر خداوند عالم لوگوں کو منع نہ فرماتا تو لوگ نصاریٰ کے کلیساؤں، یہودیوں کے کنیساؤں اور زرتشتیوں کے آتشکدوں کو تباہ و برباد کر دیتے ہیں"[2] اس آیت سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ اسلام میں عبادت گاہیں محترم ہیں اور انہیں ہرگز نقصان نہیں پہنچایا جا سکتا۔

۹۔ دینِ یہود سے انکار پر مبنی چند حدیثیں جناب رسالتمآب (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) سے نقل کی گئی ہیں مثلاً "یہودیوں کو جزیرۃ العرب سے باہر نکال دو یا جزیرۃ العرب میں دو متفاوت ادیان کی گنجائش نہیں۔" ہمیں ہر حال میں ان احادیث کی تردید کرنی چاہیے اور یہ بتانا چاہیے کہ اگر یہ احادیث صحیح ہوتیں تو حضرت ختمی مرتبت کبھی یہودی عورت سے شادی نہ کرتے۔

---

[1] وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنتُم مُّسْلِمُونَ (سورۂ آلِ عمران آیت ۱۰۲)

[2] وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُم بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَصَلَوَاتٌ۔ (سورۂ حج آیت ۴۰)

۱۰۔ لازم ہے کہ مسلمانوں کو عبادت سے روکا جائے اور اسکے وجوب کے بارے میں ان کے دلوں میں شکوک پیدا کیے جائیں۔ خاص طور سے اس نکتہ پر زور دیا جائے کہ خداوند عالم بندوں کی عبادت سے بے نیاز ہے۔ حج کو ایک بیہودہ عمل قرار دیا جائے اور مسلمانوں کو شدت کے ساتھ مکہ جانے سے روکا جائے۔ اس طرح مجالس اور اس سلسلہ کے تمام اجتماعات پر پابندی لگائی جائے۔ یہ اجتماعات ہمارے لیے خطرے کی گھنٹی ہیں اور انہیں شدت کے ساتھ روکنا ضروری ہے۔ مساجد، ائمۂ دین (علیہم السلام) کے مزارات، امام بارگاہوں اور مدرسوں کی تعمیرات پر بھی بندش عائد کی جائے۔

۱۱۔ خمس اور غنائم جنگی کی تقسیم بھی اسلام کی تقویت کا ایک سبب ہے۔ خمس کا تعلق لین دین، تجارتی اور کاروباری منافع سے نہیں ہے۔ مسلمانوں کو اس بات سے آگاہ کرنے کی ضرورت ہے کہ اس مد میں رقم کی ادائیگی پیغمبر اکرم (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) اور اماموں (علیہم السلام) کے زمانے میں واجب تھی لیکن اب علمائے دین کو اس کا اختیار نہیں ہے کہ وہ لوگوں سے اس رقم کو حاصل کریں خاص طور پر جبکہ یہ لوگ اس رقم سے ذاتی فائدے حاصل کرتے ہیں اور اپنے لیے بھیڑ بکریاں، گائے، گھوڑے، باغات اور محلات خریدتے ہیں۔ اس اعتبار سے شرعاً خمس کی رقم ان کے لیے جائز نہیں ہے۔

۱۲۔ لوگوں کو برگشتہ کرنے کے لیے یہ ظاہر کرنے کی ضرورت ہے کہ اسلام فتنہ وفساد اور ابتری اور اختلافات کا دین ہے اور اس کے ثبوت میں اسلامی ممالک میں رونما ہونیوالے واقعات کو پیش کرنا چاہیے۔

۱۳۔ اپنے آپ کو تمام گھرانوں میں پہنچا کر باپ، بیٹوں کے تعلقات کو اس حد تک بگاڑا جائے کہ بزرگوں کی نصیحت بے اثر ہو جائے اور لوگ امریت کی تہذیب و تمدّن کا شکار ہو جائیں۔ اس صورت میں ہم نوجوانوں کو ان کے دینی عقائد سے منحرف کر کے انھیں علماء سے دُور رکھ سکتے ہیں۔

۱۴۔ عورتوں کی بے پردگی کے بارے میں ہمیں سعی بلیغ کی ضرورت ہے تاکہ مسلمان عورتیں خود پردہ چھوڑنے کی آرزو کرنے لگیں۔ اس سلسلے میں ہمیں تاریخی دلائل و شواہد کا سہارا لے کر یہ ثابت کرنا ہو گا کہ پردہ کا رواج بنی عباس کے دور سے ہوا اور یہ ہرگز اسلام کی سنت نہیں ہے۔ لوگ رسول اکرمؐ کی بیویوں کو بغیر پردہ دیکھتے رہے ہیں۔ صدرِ اسلام کی عورتیں زندگی کے تمام شعبوں میں مردوں کے شانہ بشانہ رہی ہیں۔ ان کوششوں کے بارآور ہونے کے بعد ہمارے ساتھیوں کا یہ فرض ہے کہ وہ نوجوان نسل کو نامشروع جنسی روابط اور عیاشیوں کی ترغیب دیں اور اس طرح برائیوں کو اسلامی

معاشرے میں رواج دیں۔ ضروری ہے کہ غیر مسلم عورتیں پوری بے پردگی کے ساتھ اپنے آپ کو مسلم معاشرے میں پیش کریں تاکہ مسلمان عورتیں انھیں دیکھ کر ان کی تقلید کریں۔

۱۵۔ جماعت کی نماز سے لوگوں کو روکنے کے لیے ضروری ہے کہ ائمہ جمعہ و جماعت پر الزام تراشیاں کی جائیں اور ان کے فسق و فجور پر مبنی دلائل پیش کیے جائیں تاکہ لوگ متنفر ہو کر ان سے اپنا رابطہ توڑ لیں۔

۱۶۔ ہماری دشواریوں میں سے ایک بڑی دشواری بزرگانِ دین کے مزاروں پر مسلمانوں کی حاضری ہے۔ ضروری ہے کہ مختلف دلائل سے یہ ثابت کیا جائے کہ قبروں کو اہمیت دینا اور ان کی آرائشات پر توجہ دینا بدعت اور خلاف شرع ہے اور ختمی مرتبت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے زمانہ میں مردہ پرستی اور اس قسم کی باتیں رائج نہیں تھیں۔ آہستہ آہستہ ان قبروں کو مسمار کر کے لوگوں کو ان کی زیارت سے روکا جائے۔ اس سلسلے میں ایک مفید پروگرام یہ بھی ہے کہ ان مراکز کی اصلیت کے بارے میں لوگوں کو مشتبہ کیا جائے۔ مثلاً یہ کہا جائے کہ حضرت ختمی مرتبت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مسجد النبی میں مدفون نہیں ہیں بلکہ اپنی والدہ گرامی کی قبر میں سو رہے ہیں اور اسی طرح تمام بزرگانِ دین کے بارے میں کہا جائے کہ وہ ان مقامات

پر نہیں ہیں جن مقامات کو ان سے منسوب کیا گیا ہے۔ حضرت ابوبکر و عمر دونوں جنت البقیع میں مدفون ہیں۔ حضرت عثمان کی قبر کا کہیں پتا نہیں ہے۔ حضرت علی (علیہ السلام) کی آرامگاہ بصرہ میں ہے اور وہ قبر جو نجف اشرف میں مسلمانوں کی زیارت گاہ ہے درا صل اس میں مغیرہ بن شعبہ دفن ہیں۔ امام حسین (علیہ السلام) کا سرِ اقدس مسجد "حنانہ" میں دفن ہے اور آپ کے جسدِ اقدس کی تدفین کے بارے میں صحیح اطلاع نہیں ہے۔ کاظمین کی مشہور زیارت گاہ میں امام موسیٰ کاظم (علیہ السلام) اور امام نقی (علیہ السلام) کے بجائے دو عباسی خلیفہ دفن ہیں۔ مشہد میں امام رضا (علیہ السلام) نہیں بلکہ ہارون الرشید دفن ہے۔ سامرہ میں بھی امام نقی (علیہ السلام) اور امام حسن عسکری (علیہ السلام) کے بجائے عباسی خلفاء دفن ہیں۔ ہمیں بقیع کے قبرستان کے سلسلے میں کوشش کرنی چاہیے کہ وہ خاک کے یکساں ہو جائے اور تمام اسلامی ممالک کی زیارت گاہیں ویرانوں میں بدل دی جائیں۔

۱۷۔ خاندان رسالت سے اہل تشیع کی عقیدت و احترام ختم کرنے کے لیے جھوٹے اور بناوٹی سادات پیدا کیے جائیں اور اس کام کے لیے ہمیں چند تنخواہ دار افراد کی ضرورت ہے جو سیاہ اور سبز عماموں کے ساتھ لوگوں میں ظاہر ہوں اور اپنے آپ کو

اولادِ رسول سے نسبت دیں۔ اس طرح وہ لوگ جو انکی حقیقت سے واقف ہیں آہستہ آہستہ حقیقی سادات سے برگشتہ ہوجائیں گے اور اولادِ رسول پر شک کرنے لگیں گے۔ دوسرا کام ہمیں یہ کرنا ہوگا کہ ہم حقیقی سادات اور علمائے دین کے سروں سے ان کے عمامے اتروائیں تاکہ پیغمبرِ خدا (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے وابستگی کا سلسلہ ختم ہو اور لوگ علماء کا احترام چھوڑ دیں۔

۱۸۔ امام حسین (علیہ السلام) کی عزاداری کے مراکز کو ختم کر کے انہیں ویران کر دیا جائے اور یہ کام مسلمانوں کی گمراہی کی راہ روکنے اور دین کو بدبختی اور نابودی سے بچانے کے عنوان سے ہونا چاہیے۔ اپنی تمام کوششوں کو بروئے کار لاکر لوگوں کو مجالس عزا میں جانے سے روکنے کی کوشش کی جائے اور اور عزاداری کو بتدریج ختم کیا جائے۔ اس کام کے لیے امام بارگاہوں کی تعمیر اور علماء و ذاکرین کے انتخاب کی شرائط کو سخت بنایا جائے۔

۱۹۔ آزاد خیالی اور چون و چرا والی کیفیت کو مسلمانوں کے اذہان میں راسخ کرنا چاہیے تاکہ ہر آدمی آزادانہ طور پر سوچنے کے قابل ہو اور ہر کام اپنی مرضی سے انجام دے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر واجب نہیں۔ احکام شریعت کی ترویج کا

عمل متروک ہونا چاہیے۔ اگر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو واجب سمجھا جائے تو یہ کام بادشاہوں کا ہے۔ عوام الناس کو اس میں کوئی دخل نہیں۔

۲۰۔ نسل کو کنٹرول کیا جائے اور مردوں کو ایک سے زیادہ بیوی اختیار کرنے کی اجازت نہ دی جائے۔ نئے قوانین وضع کر کے شادی کے مسئلہ کو دشوار بنایا جائے مثلاً کسی عرب مرد کو ایرانی عورت اور ایرانی مرد کو عرب عورت سے شادی کی اجازت نہ دی جائے۔ اس طرح ترک، ایرانیوں سے شادی نہیں کر سکیں گے۔

۲۱۔ اسلامی تعلیم کی آفاقیت کے مسئلہ کو محکم دلائل سے رد کیا جائے اور یہ بتایا جائے کہ اسلام اصولاً دین ہدایت نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق صرف ایک قبیلہ اور ایک قوم سے ہے جیسا کہ قرآن نے اقرار کیا ہے: "یہ دین تمہاری اور تمہارے قبیلہ کی ہدایت کے لیے ہے۔"[1]

۲۲۔ مساجد، مدارس، تربیتی مراکز اور اچھی بنیادوں پر قائم ہونے والی تعمیرات سے متعلق اسلام کی تمام سنتوں کو کالعدم یا کم از کم محدود کر دیا جائے۔ اس قسم کے امور کا تعلق علماء سے

---

[1] وَاِنَّهٗ لَذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِكَ (سورہ زخرف آیت ۴۴)

نہیں بلکہ سربراہان مملکت سے ہے اور جب حکومتیں اس قسم کا
کام انجام دیں گی تو از خود ان کی دینی قدر و قیمت جاتی
رہے گی۔

۲۳۔ ضروری ہے کہ مسلمانوں کے ہاتھوں میں موجود قرآن میں کمی بیشی کرکے لوگوں کو شک میں مبتلا کیا جائے۔ خاص طور پر کفار اور یہود و نصاریٰ کے بارے میں توہین آمیز آیات نیز امر بالمعروف اور جہاد سے متعلق آیتوں کو قرآن سے حذف کیا جائے اور ان قرآنوں کو ترکی اور فارسی زبانوں میں ترجمہ کرکے بازاروں میں لایا جائے۔ غیر عرب مسلم حکومتوں کو ترغیب دی جائے کہ وہ اپنے اپنے علاقوں میں قرآن، اذان اور نماز کو عربی زبان میں پڑھنے سے پرہیز کریں۔ دوسرا مسئلہ احادیث و روایات میں تشکیک پیدا کرنا ہے اور قرآن کی طرح اس میں بھی تحریف و ترجمہ سے کام لینا ہے۔

مختصر یہ کہ اس دوسری کتاب میں بھی مجھے بڑی کارآمد چیزیں دکھائی دیں۔ اس کتاب کا نام "اسلام کو کیونکر صفحہ ہستی سے مٹایا جائے" رکھا گیا تھا۔ اس میں وہ بہترین عملی پروگرام مرتب تھے جن پر مجھے اور میرے دیگر ساتھیوں کو کام کرنا تھا۔ اس کتاب نے مجھ پر بڑا اثر قائم کیا تھا۔ کتاب کے مطالعے کے بعد میں اسے واپس کرنے نوآبادیاتی علاقوں کی وزارت پہنچا جہاں دوسری مرتبہ

سیکریٹری سے میری ملاقات ہوئی۔ اس نے مجھے مخاطب کر کے کہا:

"جن امور کو تمہیں انجام دینا ہے اس میں تم اکیلے نہیں ہو بلکہ تقریباً پانچ ہزار سچے اور کھرے افراد مختلف گروہوں کی صورت میں تمام اسلامی ممالک میں تمہاری مدد کے لیے آمادہ ہیں۔ نوآبادیاتی علاقوں کی وزارت کا خیال ہے کہ وہ کام کی پیشرفت کے ساتھ ساتھ ان افراد کی تعداد میں اضافہ کر کے انھیں ایک لاکھ تک پہنچا دے۔ جب بھی ہمیں اس عظیم گروہ کی تشکیل میں کامیابی ہوئی یقیناً ہم تمام عالمِ اسلام پر چھا جائیں گے اور اسلامی آثار کو مکمل طور پر مٹا دیں گے۔"

اس کے بعد سیکریٹری نے اپنی گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا:

"میں تمہیں یہ خوشخبری دیتا ہوں کہ ہم آئندہ ایک صدی میں اپنی مراد کو پہنچ جائیں گے اور اگر آج ہماری نسل اس کامیابی کو نہ دیکھ سکے تو ہماری اولادیں ضرور یہ اچھے دن دیکھیں گی اور یہ ایرانی ضرب المثل کتنی معنی خیز ہے جس میں کہا گیا ہے "کل دوسروں نے بویا ہم نے کھایا۔ آج ہم بو رہے ہیں کل دوسرے کھائیں گے۔" جس دن بھی عظیم برطانیہ یا (سمندروں کی ملکہ) کو اسلامی ممالک پر فتح مندی نصیب ہوئی دنیائے مسیحیت ان تمام

تکالیف سے نجات پا جائے گی جسے وہ بارہ صدیوں سے برداشت کر رہی ہے۔ مسلمانوں نے اس عرصے میں ہم پر بڑی جنگیں مسلط کیں جن میں صلیبی جنگیں بطور مثال ہیں۔ یہ جنگیں بالکل مغلوں کی یلغار کی طرح بے مقصد تھیں کہ جہاں سوائے قتل و غارت گری، ویرانی و تباہی اور لوٹ مار کے، کوئی مقصد نہیں تھا لیکن اسلام کے خلاف ہماری جنگ مغلوں کی طرح فوجی کارروائیوں اور قتل و غارتگری پر منحصر نہیں ہے۔ ہمیں اس کام میں جلدی بھی نہیں ہے۔ عظیم برطانیہ کی حکومت اسلام کو مٹانے کے لیے پورے مطالعہ کے ساتھ آگے بڑھے گی اور بڑے صبر و تحمل کے ساتھ اپنے عظیم کاموں کو بروئے کار لائے گی اور اپنے مقصد میں کامیاب ہوگی البتہ ہم ضروری مواقع پر فوجی کارروائیوں سے بھی دریغ نہیں کریں گے مگر یہ اس صورت میں ہوگا جب ہم اسلامی حکومتوں پر پوری طرح چھا جائیں گے اور کچھ عناصر ہماری مخالفت پر کمربستہ ہو کر میدان میں اتر آئیں گے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ استنبول کے حکمران بڑی ہوشمندی اور فطانت کے مالک ہیں اور اتنی جلد ہمیں اپنے پروگراموں میں کامیاب نہیں ہونے دیں گے لیکن ہمیں ابھی سے متوسط طبقے کے بچوں کو ان اسکولوں میں تربیت دینا ہے جو ہم نے ان کے لیے قائم کیے ہیں۔ ہمیں ان علاقوں میں متعدد چرچ بھی

بنانے ہیں۔ شراب، جوا اور شہوت رانی کو اس طرح پھیلانا ہے کہ نوجوان نسل دین و مذہب کو بھول جائے۔ ہمیں اسلامی ممالک کے حکمرانوں کے درمیان اختلافات کی آگ کو بھی ہوا دینا ہے۔ ہر طرف ہرج مرج اور فتنہ و فساد کا بازار گرم کرنا ہے۔ ارکان حکومت اور صاحبان ثروت کو حسین و جمیل اور شوخ و چنچل عیسائی عورتوں کے دام میں پھنسانا ہے اور ان کی محفلوں کو ان پری وشوں سے رونق بخشنا ہے تاکہ وہ آہستہ آہستہ اپنے دینی اور سیاسی اقتدار سے ہاتھ دھو بیٹھیں۔ لوگ ان سے بدظن ہو جائیں اور اسلام کے بارے میں ان کا ایمان کمزور ہو جائے جس کے نتیجہ میں علماء، حکومت اور عوام کا اتحاد ٹوٹ جائے اور ایسے حالات میں جنگ کی آگ بھڑکا کر ہم ان ممالک میں اسلام کی جڑ بنیاد اکھاڑ پھینکیں گے۔"

آخرکار نوآبادیاتی علاقوں کی وزارت کے سیکریٹری نے اس دوسرے راز سے بھی پردہ اٹھایا جس کا اس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا اور میں شدت سے جس کے انتظار میں تھا اور یہ وہ قرارداد تھی جو حکومت برطانیہ کے اعلیٰ عہدہ داروں نے منظور کی تھی۔ پچاس صفحات پر مشتمل یہ قرارداد نوآبادیاتی علاقوں کی وزارت کی اس سیاست کی آئینہ دار تھی جس کے ذریعے اسلام اور اہل اسلام کو ایک صدی کے اندر اندر نابود کرنا تھا۔ اس رسالہ کی پیشین گوئی کے مطابق اس عرصے کے بعد اسلام ساری د سے رخصت ہو جائے گا اور صرف تاریخ میں اس کا نام باقی رہ جائے گا۔ اس بات کی سختی سے تاکید کی گئی تھی کہ ۱۴ نکاتی قرارداد کے مضمون کو صیغۂ راز میں رکھا جائے اور یہ کسی عنوان سے ظاہر نہ ہونے پائے کیونکہ اس بات کا خطرہ تھا کہ مسلمانوں کو اس کی

خبر ہوجائے اور وہ اس کی چارہ جوئی میں اٹھ کھڑے ہوں۔ تاہم مختصر طور پر اس کا مواد کچھ یوں تھا:

۱۔ تاجکستان، بخارا، ارمنستان، شمالی خراسان اور ماوراءالنہر اور روس کے جنوب میں واقع مسلم آبادیوں پر اختیار حاصل کرنے کے لیے سلطنت روس سے وسیع پیمانے پر اشتراک عمل، اس کے علاوہ ایران کے سرحدی شہروں ترکستان اور آذربائیجان پر تسلّط حاصل کرنے کے لیے روس کے ساتھ اشتراکِ عمل۔

۲۔ اسلامی حکومتوں کو اندرونی اور بیرونی اعتبار سے پوری طرح تباہ کرنے کے لیے ایک منظم پروگرام کی تشکیل میں روس اور فرانس کے سلاطین کے ساتھ اشتراک عمل۔

۳۔ عثمانی اور ایرانی حکومتوں کے دیرینہ تنازعات کو ہوا دینا اور ان کے درمیان قومی اور نسلی اختلافات کی آگ بھڑکانا۔ عراق اور ایران کے اطراف میں آباد قبیلوں میں قبائلی جنگیں اور شورشیں پیدا کرنا۔ ما قبل اسلام مذاہب کی تبلیغ حتّیٰ کہ ایران، مصر اور بین النہرین کے متروک اور مردہ ادیان کا احیاء اور ان کے پیروکاروں کو اسلام سے پھرانا۔

۴۔ اسلامی ممالک کے شہروں اور دیہاتوں کے بعض حصوں کو غیر مسلم اقوام کے حوالے کرنا مثلاً مدینہ یہودیوں کو، اسکندریہ عیسائیوں کو، یزد پارسیوں کو، عمارہ صابیئوں کو، کرمان شاہ علی اللّٰہیوں کو، موصل

یزیدیوں کو اور بوشہر سمیت خلیج فارس کے قرب و جوار کے علاقے ہندوؤں کو سونپنا۔ ان دو آخر الذکر علاقوں میں پہلے اہل ہند کو بسانا ضروری ہے۔ اسی طرح لبنان میں واقع طرابلس دروزیوں کے، قارص علویوں کے اور مسقط خوارج کے حوالے کرنا۔ یہی نہیں بلکہ مادی امداد، جنگی ساز و سامان اور فوجی اور سیاسی ماہرین کے ذریعے انھیں مضبوط بنانا بھی ضروری ہے تاکہ کچھ عرصے بعد یہ اقلیتیں اہل اسلام کی آنکھوں میں کھٹکنے لگیں اور اسلام کا پیکر آزردہ ہو جائے اور علاقے میں بتدریج ان کا اثر و نفوذ مسلم حکومتوں کی تباہی کا سبب بن جائے اور اسلام کی ترقی پذیری میں رخنہ پڑ جائے۔

۵۔ ہندوستان کی طرح ایرانی اور عثمانی حکومتوں میں بھی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کا قیام عمل میں آئے اور پھر پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو یا بہتر الفاظ میں "پھوٹ ڈالو اور مٹا دو" کے قانون پر عمل کرتے ہوئے انھیں ایک دوسرے سے بھڑا دیا جائے۔ اس صورت میں ایک طرف وہ آپس میں دست و گریباں ہوں گے اور دوسری طرف مرکزی حکومت سے بھی ان کے تنازعہ کا سامان فراہم رہے گا۔

۶۔ ایک سوچے سمجھے منظم منصوبے کے تحت اسلامی دنیا میں لوگوں کے افکار سے ہم آہنگی رکھنے والے من گھڑت عقائد و مذاہب

کی تبلیغ مثلاً ائمہ اہلبیت (علیہم السلام) سے بے انتہا عقیدت و احترام رکھنے والے شیعوں کے لیے حسین اللّٰہی مذہب، امام جعفر صادق (علیہ السلام) کی ذات سے متعلق شخصیت پرستی، امام علی رضا (علیہ السلام) اور امام غائب (حضرت مہدی موعود عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف) کے بارے میں مبالغہ آرائی اور ہشت امامی فرقہ کی ترویج۔ ہر ہر مذہب کے لیے اس کے مناسب ترین مقام کی یہ صورت ہوگی: حسین اللہ فرقہ (کربلا) امام جعفر صادقؑ کی پرستش (اصفہان) امام مہدی (علیہ السلام) کی پرستش (سامرہ) اور ہشت امامی مذہب (مشہد)۔ ان جعلی مذاہب کی تبلیغ وترویج کا دائرہ صرف شیعہ مذہب ہی تک محدود نہیں ہونا چاہیے بلکہ اہل تسنن کے تمام فرقوں میں بھی اس قسم کے مذاہب کو ترویج دیا جانا چاہیے اور پھر ان میں اختلافات کو ہوا دے کر نفرت کا وہ بیج بونا چاہیے کہ ان میں کا ہر فرقہ اپنے آپ کو سچا مسلمان اور دوسرے کو کافر، مرتد اور واجب القتل سمجھے۔

۷۔ زنا، لواطہ، شراب نوشی اور جوا وہ اہم امور ہیں جنہیں مسلمانوں کے درمیان رائج کرنے کی ضرورت ہے۔ ان بری عادتوں کو مسلمانوں میں پھیلانے کے لیے علاقے کے ان لوگوں سے زیادہ مدد لینی چاہیے جو ماقبل اسلام مذاہب سے وابستہ ہیں اور

خوش قسمتی سے ان کی تعداد کچھ کم نہیں ہے۔

۸۔ اہم اور حساس عہدوں پر غلط کار اور ناپاک افراد کا تقرر اور اس بات پر توجہ کہ ریاستوں کی سربراہی نوآبادیاتی علاقوں کی وزارت سے وابستہ رہنی چاہیے تاکہ وہ انگلستان کی حکومت کے لیے کام کریں اور ان سے احکامات وصول کریں۔ پھر ان باثر افراد کے ذریعے ہمارے مقاصد پوشیدہ طور پر قوت کے سہارے روبعمل آئیں البتہ ان کے چناؤ میں مسلم بادشاہوں کا ہاتھ ہوگا۔

۹۔ غیر عرب مسلم ممالک میں عربی ثقافت اور زبان کے پھیلاؤ کی راہ روکنا اور اس کے بجائے سنسکرت، فارسی، کردی، پشتو، اردو اور قومی زبانوں کو ان سرزمینوں پر رائج کرنا تاکہ علاقائی زبانیں رواج پاکر عربی زبان بولنے والے قبائل میں اتر آئیں اور فصیح عربی زبان کی جگہ اختیار کریں۔ اس طرح اہل عرب کا قرآن اور سنت کی زبان سے رشتہ ٹوٹ جائے گا۔

۱۰۔ حکومتی دفاتر میں مشیروں اور ماہروں کی حیثیت سے برطانوی عمال اور جاسوسوں کی تعیناتی میں اضافہ، اس طرح اسلامی ممالک کے وزراء اور امراء کے فیصلوں میں ہمارا رنگ شامل رہے گا۔ اس مقصد تک پہنچنے کے لیے سب سے بہتر راستا یہ ہوگا کہ پہلے ہم ذہین اور معتمد غلاموں اور کنیزوں کو تعلیم و تربیت دیں اور پھر انھیں حکمرانوں، شاہزادوں، وزیروں، امیروں اور

اہم درباری عہدوں پہ فائز بااثر افراد کے ہاتھوں بیچ دیں۔ یہ غلام اپنی صلاحیتوں اور فہم و فراست کی بنیاد پر ان کے نزدیک اپنا مقام پیدا کریں گے اور آہستہ آہستہ انہیں مشاورکا مقام حاصل ہو جائے گا۔ اس طرح مسلم رجال میں ان کا ایک انمٹ نقش قائم ہو جائے گا۔

۱۱۔ مسلمانوں کے مختلف طبقوں خاص طور پر ڈاکٹروں، انجینئروں، حکومت کے مالی امور سے وابستہ عہدہ داروں اور ان جیسے دیگر روشن فکر افراد میں مسیحیت کی تبلیغ و ترویج، کلساؤں، خصوصی اسکولوں اور کلیسا سے وابستہ شفا خانوں کی تعداد میں اضافہ، تبلیغاتی کتب و رسائل کی نشر و اشاعت اور متوسط طبقے کے لوگوں میں ان کی مفت تقسیم، تاریخ اسلام کے مقابلہ پر تاریخ مسیحیت کی نگارش کا اہتمام، مسلمانوں کے حالات و کیفیات اور ان میں حکومت برطانیہ کے عمال اور جاسوسوں کا تقرر البتہ ان کا دائرہ عمل اسلامی ممالک میں واقع دیرو کلیسا ہی ہوں گے۔ ان عالم نما عیسائیوں میں بعض کا کام یہ ہوگا کہ وہ مستشرق اور اسلام شناس بن کر تاریخی حقائق میں تحریف کریں اور انھیں برعکس دکھانے کی کوشش کریں اور پھر دلائل کی فراہمی اور اسلامی ممالک سے ضروری اطلاعات حاصل کرنے کے بعد ایسے مقالے تیار کریں جو اسلام کے

نقصان اور عیسائیت کے فائدے میں ہوں۔

۱۲۔ مسلمان لڑکوں اور لڑکیوں میں خودسری اور مذہب بےزاری کی ترویج اور انہیں اسلام کے اصول ومبانی کی سچائی کے بارے میں بدظن کرنا اور یہ کام مشنری اسکولوں، مخربِ اخلاق اور اسلام دشمنی پر مبنی کتابوں، عیش ونوش اور خوش باشی کا سامان فراہم کرنے والے کلبوں اور غلط بنیادوں پر استوار مسلم اور غیر مسلم نوجوانوں کی دوستی کے ذریعے انجام پا سکتا ہے۔ مسلم نوجوانوں کو پھانسنے کے لیے یہودی اور مسیحی نوجوانوں کی شراکت سے خفیہ انجمنوں کی تاسیس۔

۱۳۔ اسلام کو کمزور کرنے، مسلمانوں کے اتحاد کو توڑنے اور انہیں زندگی کے مسائل کے بارے میں سوچنے اور ترقی کی راہ میں آگے بڑھنے سے روکنے کے لیے اسلامی ممالک میں اندرونی اور بیرونی طور پر شورشیں پیدا کرنا اور مسلمانوں کو ایک دوسرے یا پھر دیگر ادیان کے پیروکاروں سے بھڑائے رکھنا۔ قومی دولت، مالی ذخائر اور فکر وفہم کی قوتوں کو تباہی سے دوچار کرنا، مسلمانوں میں روحِ عمل اور ولولہ انگیزی کو ختم کرنا اور ان میں انتشار پیدا کرنا۔

۱۴۔ اسلامی ممالک کے اقتصادی نظام کو درہم برہم کرنا جس میں زراعت اور آمدنی کے تمام ذرائع شامل ہیں۔ اس مقصد کو

پورا کرنے کے لیے بندوں میں شگاف پیدا کرنا، دریاؤں میں
ریت کی سطح اونچی کرنا، لوگوں میں سستی، سہل انگاری اور
تن آسانی کو فروغ دینا، پیداوار اور تولیدی امور کی طرف
سے لوگوں کی بے توجہی کو تقویت دینا اور عوام کو منشیات کا
عادی بنانا ضروری ہے۔

اس بارے میں یہ وضاحت ضروری ہے کہ مذکورہ ۱۴ نکات
انتہائی شرح وبسط کے ساتھ ضبط تحریر میں لائے گئے تھے اور ان
کے ساتھ نقشے، علامتیں اور تصویریں بھی تھیں۔ میں نے یہاں
اشارتاً ان کی نشاندہی کی ہے۔

مختصر یہ کہ نوآبادیاتی علاقوں کی وزارت کے سیکرٹری سے اس
بھروسے کی بنیاد پر جو اس نے میری ذات سے وابستہ کر رکھی تھی
اور جس کے زیر اثر اس نے مجھے اتنی اہم اور خفیہ کتاب پڑھنے کو
دی تھی میں نے دوسری بار بصد احترام اظہار تشکر کیا اور مزید ایک
مہینے لندن میں رہا۔ اس کے بعد وزیر کی طرف سے مجھے عراق
جانے کا حکم ملا۔ میرا یہ سفر صرف اس مقصد کے لیے تھا کہ میں محمد بن
عبدالوہاب کو نئے دین کے اظہار کی دعوت پر آمادہ کروں۔ سیکرٹری
نے بار بار مجھے یہ تاکید کی کہ میں اس کے ساتھ بڑی درایت اور ہوشیاری
سے پیش آؤں اور مقدماتِ امور کی آمادگی میں ہرگز حدِ اعتدال
سے آگے نہ بڑھوں کیونکہ عراق وایران سے موصول ہونیوالی رپورٹوں

کی بنیاد پر سیکریٹری کو اس بات کا یقین ہو چکا تھا کہ محمد بن عبدالوہاب قابل بھروسہ اور نوآبادیاتی علاقوں کی وزارت کے پروگراموں کو روبعمل لانے کے لیے مناسب ترین آدمی ہے۔

اس کے بعد سیکریٹری نے اپنی گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا:

"تمہیں محمد کے ساتھ بالکل واضح اور دوٹوک الفاظ میں گفتگو کرنی ہے کیونکہ ہمارے عمال اصفہان میں اس سے بڑی صراحت کے ساتھ پہلے ہی گفتگو کر چکے ہیں اور وہ ان کی باتوں کو مان چکا ہے مگر اس شرط کے ساتھ کہ اسے عثمانی حکومت کے مقامی عمال، علماء اور متعصب لوگوں کے ہاتھوں آنے والے خطرات سے بچا لیا جائے اور اس کی حمایت اور تحفظ کا بھرپور انتظام کیا جائے کیونکہ اس کی دعوت کے ظاہر ہوتے ہی ہر طرف سے اسے ختم کرنے کی کوشش کی جائے گی اور خطرناک صورتوں میں اس پر حملے کیے جائیں گے۔"

حکومت برطانیہ نے شیخ محمد بن عبدالوہاب کو اسلحے سے اچھی طرح لیس کرنے کے بعد ضرورت کے موقع پر اس کی مدد کی تائید کی تھی اور شیخ ہی کی مرضی کے مطابق جزیرۃ العرب میں واقع نجد کے قریب علاقے کو اس کی حاکمیت کا پہلا مقام قرار دیا تھا۔

بہرحال شیخ کی موافقت کی خبر سن کر میری خوشی کی کوئی انتہا

نہ رہی اور میں نے سیکریٹری سے صرف یہ سوال کیا کہ میری آئندہ کی ذمہ داریاں کیا ہوں گی؟ مجھے اس کے بعد کیا کرنا ہوگا اور شیخ سے کس قسم کا کام لینا ہوگا۔ نیز یہ کہ میں اپنے فرائض کا کہاں سے آغاز کروں؟

سیکریٹری نے جواب دیا: نوآبادیاتی علاقوں کی وزارت نے تمہارے وظائف کو بڑی وضاحت سے متعین کیا ہے اور وہ ان امور کا انتقاء ہے جسے شیخ کو تدریجاً انجام دینا ہے اور وہ یہ ہیں:

۱۔ اس کے مذہب میں شمولیت اختیار نہ کرنے والے مسلمانوں کی تکفیر اور ان کے مال، عزت اور آبرو کی بربادی کو روا سمجھنا، اس ضمن میں گرفت رکیے جانے والے مخالفین کو بردہ فروشی کی مارکیٹ میں کنیز و غلام کی حیثیت سے بیچنا۔

۲۔ بت پرستی کے بہانے بصورت امکان خانہ کعبہ کا انہدام اور مسلمانوں کو فریضہ حج سے روکنا اور حاجیوں کے جان و مال کی غارتگری پر قبائل عرب کو اکسانا۔

۳۔ عرب قبائل کو عثمانی خلیفہ کے احکامات سے سرتابی کی ترغیب دینا اور ناخوش لوگوں کو ان کے خلاف جنگ پر آمادہ کرنا۔ اس کام کے لیے ایک ہتھیار بند فوج کی تشکیل۔ اشراف حجاز کے احترام اور اثر و نفوذ کو توڑنے کے لیے انہیں ہر ممکن طریقے سے پریشانیوں میں مبتلا کرنا۔

۴۔ پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ان کے جانشینوں اور کلی طور پر

اسلام کی برگزیدہ شخصیتوں کی اہانت کا سہارا لے کر اور اسی طرح شرک و بت پرستی کے آداب و رسوم کو مٹانے کے بہانے مکہ، مدینہ اور دیگر شہروں میں جہاں تک ہو سکے مسلمانوں کی زیارت گاہوں اور مقبروں کی تاراجی۔

۵۔ جہاں تک ممکن ہو سکے اسلامی ممالک میں فتنہ و فساد، شورش اور بد امنی کا پھیلاؤ۔

۶۔ قرآن میں کمی بیشی پر شاہد احادیث و روایات کی رو سے ایک جدید قرآن کی نشر و اشاعت۔

سیکریٹری نے اپنے اس چھ نکاتی پروگرام کی تشریح کے بعد جسے شیخ محمد بن عبدالوہاب کو انجام دینا تھا اپنی گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا:

"کہیں اس پروگرام کی دشواریاں تمہیں گھبراہٹ میں مبتلا نہ کر دیں۔ ہم سب کا یہ فرض ہے کہ اسلام کی تباہی کا بیج اس سرزمین میں بکھیر دیں تاکہ ہماری آئندہ آنے والی نسل ہماری اس راہ پر آگے بڑھے اور کسی فیصلہ کن نتیجے پر پہنچ سکے۔ برطانیہ کی حکومت ہماری اس صبر آزما و دراز مدت کوششوں سے واقف ہے۔ کیا محمد (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) نے یک و تنہا اپنے اس تباہ کن انقلاب کو برپا نہیں کیا۔ محمد بن عبدالوہاب بھی (نعوذ باللہ) محمد (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) کی طرح ہمارے

پیشِ نظر انقلاب کو شعلہ ور کر سکے گا۔"

اس ملاقات کے کچھ دن بعد میں نے وزیر اور سیکریٹری سے سفر کی اجازت مانگی اور پھر گھر والوں اور دوستوں کو وداع کیا۔ گھر سے باہر نکلتے ہوئے میرے چھوٹے لڑکے نے ملتمسانہ لہجے میں کہا: "بابا جلدی گھر آیئے گا۔" اس کے اس جملے نے میری آنکھیں چھلکا دیں اور میں ان اشکوں کو اپنی بیوی سے نہ چھپا سکا۔ رخصت کے آخری مراسم طے کر کے میں آمادۂ سفر ہوا۔

ہمارا جہاز بصرہ کی سمت روانہ ہوا۔ بڑے دشوار اور سخت سفر کے بعد رات کے وقت میں بصرہ پہنچا اور سیدھا عبدالرضا نرکف ان کے گھر پہنچا۔ وہ بیچارہ سو رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی بہت خوش ہوا اور بڑی گرمجوشی سے میرا استقبال کیا۔ میں نے رات وہاں کاٹی۔ دوسرے دن صبح مجھے عبدالرضا سے معلوم ہوا کہ شیخ محمد بن عبدالوہاب کچھ عرصے پہلے ایران سے بصرہ پہنچا اور ابھی چند دن پہلے کسی نامعلوم مقام کی طرف خداحافظ کہہ کر گیا ہے۔ عبدالرضا نے یہ بھی بتایا کہ شیخ میرے نام اسے ایک خط بھی دے گیا ہے۔ اس خط میں اس نے اپنا پتا نجد لکھا تھا۔

دوسرے دن میں اکیلا عازمِ نجد ہوا اور بڑی زحمتوں کے بعد منزلِ مقصود پر پہنچا اور شیخ سے اس کے گھر پر ملا۔ اس کے چہرے پر تھکاوٹ اور کمزوری کے آثار نمایاں تھے۔ میں نے اس موضوع پہ

اس سے گفتگو مناسب نہیں سمجھی لیکن جلد ہی مجھے پتا چل گیا کہ اس نے دوسری شادی رچالی ہے اور جنسی روابط میں افراط سے کام لے کر اپنی طاقت کھو بیٹھا ہے۔ میں نے اس بارے میں اسے نصیحتیں کیں اور بتایا کہ ابھی ہم دونوں کو مل کر بہت سے امور انجام دینے ہیں۔

اس منزل پر ہم نے یہ طے کیا کہ میں اپنے آپ کو "عبداللہ" کے فرضی نام سے بطور غلام پیش کروں گا اور بتاؤں گا کہ شیخ نے مجھے بردہ فروشوں کے گروہ سے خریدا ہے چنانچہ شیخ نے لوگوں سے میرا اسی عنوان سے تعارف کرایا اور بتایا کہ میں بصرہ میں اس کے کام سے ٹھہرا ہوا تھا اور اب یہاں جا رہے پہنچا ہوں۔

نجد کے رہنے والے مجھے شیخ محمد بن عبدالوہاب کا غلام سمجھتے تھے۔

یہاں یہ بھی بتانا ضروری ہوگا کہ اس مقام پر شیخ کی دعوت کا سامان فراہم کرنے میں ہمیں دو سال کا عرصہ لگا۔ ۱۱۴۳ھ کے اواسط میں محمد بن عبدالوہاب نے جزیرۃ العرب میں اپنے نئے دین کے اعلان کا حتمی ارادہ کیا اور اپنے دوستوں کو اکٹھا کیا جو اس کے ہم خیال تھے اور اس کا ساتھ دینے کا وعدہ کر چکے تھے۔ ابتدا میں صرف اپنے خاص اصحاب اور مریدوں کے دائرہ میں چند مبہم اور غیر واضح الفاظ میں بڑے اختصار کے ساتھ اس دعوت کا آغاز ہوا لیکن کچھ عرصے بعد نجد کے ہر طبقہ خیال کے افراد کو بڑے پیمانے پر دعوت نامے بھیجے گئے۔ آہستہ آہستہ ہم نے پیسہ کے زور پر شیخ کے اطراف اس کے افکار کی

حمایت میں ایک بڑا مجمع اکٹھا کیا اور انھیں دشمنوں سے نبرد آزما ہونے کی تلقین کی۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ جزیرۃ العرب میں شیخ کی دعوت کے پھیلنے کے ساتھ ساتھ اس کے دشمنوں اور مخالفوں کی تعداد بھی بڑھنے لگی۔

جلد ہی رکاوٹوں اور دشمنیوں کا سلسلہ اس منزل تک پہنچا کہ شیخ کے پاؤں اکھڑنے لگے۔ خاص طور پر نجد میں اس کے خلاف بڑی خطرناک باتیں پھیلی ہوئی تھیں۔ میں نے بڑی قاطعیت کے ساتھ اسے جمے رہنے کی ترغیب دی اور اس کے ارادے کو سست نہیں ہونے دیا۔ میں ہمیشہ اس سے کہتا تھا: "بعثت کے ابتدائی دنوں میں اللہ کے رسول حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے دشمن تمہارے دشمنوں سے بدرجہا زیادہ طاقتور تھے مگر آپ ان کی پیدا کردہ دشواریوں اور مصیبتوں کو بڑے تحمل کے ساتھ جھیلتے رہے۔ ان اذیتوں، تہمتوں اور دشنام طرازیوں کو سہے بغیر کسی بڑی راہ پر گامزن ہونا اور بلندیوں کو چھونا ناممکن ہے۔ کوئی پیشوا اور کوئی رہبران دشواریوں سے دامن چھڑا نہ سکا۔

اس طرح ہم نے اپنی جد وجہد کا آغاز کیا اور خطرناک دشمنوں کے مقابل آئے۔ جنگ وگریز اس مبارزہ میں ہماری حکمت عملی تھی۔ ہمارے کامیاب پروگراموں میں سے ایک پروگرام شیخ کے دشمنوں کو پیسے کے ذریعے توڑنا تھا۔ ہمارے یہ تنخواہ داراب مخالفین کی صف میں

رہ کر ہمارے لیے جاسوسی کرتے تھے اور ان کے ارادوں سے ہمیں آگاہ رکھتے تھے۔ ہم اپنے ان بظاہر دشمن ساتھیوں کی اطلاعات کے ذریعے مخالفوں کی تمام اسکیموں کو نقش بر آب کیا کرتے تھے۔ مثلاً ایک بار میں نے سنا کہ چند آدمیوں کے ایک گروہ نے شیخ کو قتل کرنے کا ارادہ کیا ہے میں نے فوری اقدامات کے ذریعے اس قتل کی سازش کو ناکام بنا دیا اور اس گروہ کو اتنا رسوا کیا کہ بات شیخ کے حق میں تمام ہوئی اور لوگوں نے دہشت گردوں کا ساتھ چھوڑ دیا۔

آخر کار شیخ محمد بن عبدالوہاب نے مجھے یہ اطمینان دلایا کہ وہ نوآبادیاتی علاقوں کی وزارت کے چھ نکاتی پروگرام کو روبہ عمل لانے میں اپنی پوری کوشش کرے گا۔ تاہم اس نے دو نکات کے بارے میں خاطر خواہ جواب نہیں دیا۔ ان میں سے ایک مکہ پر تصرف حاصل کرنے کے بعد خانہ کعبہ کا انہدام تھا۔ شیخ کے نزدیک یہ ایک بیہودہ اور خطرناک کام تھا کیونکہ اہلِ اسلام اتنی جلدی اسکے دعوے کو تسلیم کرنیوالے نہیں تھے اور یہی صورت حج کو بت پرستی قرار دینے کی تھی اور دوسرا امر جو اسکے بس سے باہر تھا وہ ایک جدید قرآن کی نگارش تھی۔ وہ قرآن کے مقابل نہیں آنا چاہتا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ مکہ اور استنبول کے حکام سے بہت خائف تھا اور کہتا تھا اگر میں نے کعبہ کو ڈھا دیا اور نئے قرآن کی نگارش کی تو اس بات کا خطرہ ہے کہ عثمانی حکومت ایک بڑی فوج میری سرکوبی کے لیے عربستان بھیجے اور ہم اس پر پورے نہ اتر سکیں۔ میں نے اسکے عذر کو معقول سمجھا اور اندازہ لگایا

کہ اس دور کی سیاسی اور مذہبی فضا اس بات کی متقاضی نہیں ہے۔

محمد بن عبدالوہاب کی دعوت کے برسوں بعد جب چہار نکاتی پروگرام کامیابی کی پوری منزلیں طے کر چکا تو نوآبادیاتی علاقوں کی وزارت نے ارادہ کیا کہ اب سیاسی اعتبار سے بھی جزیرۃ العرب میں کوئی کام ہونا چاہیے۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے اپنے عمال میں سے محمد بن سعود[1] کو محمد بن عبدالوہاب کیساتھ اشتراکِ عمل پر مامور کیا اور اس کام کے لیے محمد بن عبدالوہاب کے پاس خفیہ طور پر ایک نمائندہ بھی بھیجا تاکہ وہ اسکے سامنے حکومت برطانیہ کے مقاصد کی توضیح کرے اور "محمدین[2]" کے اشتراکِ عمل کی ضرورت پر زور دے اور تاکید کرے کہ دینی امور کے فیصلے کلی طور پر محمد بن عبدالوہاب کے ہاتھ میں ہونگے اور سیاسی امور کی نگرانی محمد بن سعود کی ذمہ داری ہوگی۔ نوآبادیاتی علاقوں کی وزارت کا ہدف مسلمانوں کے جسم و جان دونوں پر اپنا اثر قائم کرنا تھا اور تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ سیاسی حکومتوں سے دینی حکومتیں زیادہ دیرپا اور طاقتور رہی ہیں۔

اس طرح دینی اور سیاسی شخصیتوں کے اتحادِ عمل کے نتیجے میں انگریزوں کا بھلا ہو رہا تھا اور ہر آنیوالا دن اس بھلائی میں اضافہ کر رہا تھا۔ ان دونوں رہبروں نے نجد کے قریب "درعیہ شہر" کو اپنا پایہ تخت بنایا۔ نوآبادیاتی علاقوں کی وزارت خفیہ طور پر جی کھول کر انکی مالی اعانت کر رہی تھی۔ مذکورہ وزارت

---

[1] سعودی خاندان کا مورث اعلیٰ جس نے ۱۱۴۷ھ میں وہابی مذہب اختیار کیا اور حکومت برطانیہ کی طرف سے نجد کا حکمران بنا اور ۱۱۷۹ھ میں موت سے ہمکنار ہوا۔

[2] یعنی محمد بن عبدالوہاب اور محمد بن سعود۔

کی پلاننگ کے تحت حکومت کو بظاہر کچھ غلام خریدنے تھے جو دراصل نوآبادیاتی علاقوں کی وزارت ہی کے کچھ آدمی تھے جنہیں عربی زبان پر عبور حاصل تھا اور جو صحرائی جنگوں کے فنون سے بھی واقف تھے۔ ان تمام باتوں کا انتظام بھی ہماری حکومت نے کیا تھا۔ میں نے ان افراد کے اشتراکِ عمل سے جو تعداد میں گیارہ تھے اس اسلامی حکومت کی دینی اور سیاسی راہیں معین کیں۔ دونوں "محمد" اپنے فرائض سے بخوبی واقف تھے اور ان معین کی جانیوالی راہوں پر تیلے قدموں سے آگے بڑھ رہے تھے۔ یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ کبھی کبھار ان دونوں کے درمیان جزوی طور پر کشمکش ہو جایا کرتی تھی اور وہیں اسی وقت فیصلہ بھی ہو جایا کرتا تھا اور نوآبادیاتی علاقوں کی وزارت کو اس میں دخالت کی ضرورت پیش نہیں آتی تھی۔

ہم نے نجد کے اطراف کی لڑکیوں سے شادیاں کیں۔ ہمیں اس بات کا اعتراف ہے کہ مسلمان عورتوں میں محبت، خلوص اور شوہرداری کی صفت واقعی حیرت انگیز اور قابلِ تعریف ہے۔ ہم ان رشتوں کے ذریعے اہلِ نجد کے ساتھ دوستی، ہمدلی اور تعلقات کو اور زیادہ مضبوط بنا سکے۔

اس وقت ہم انکے ساتھ اپنی دوستی کی معراج پر ہیں۔ مرکزی حکومت تمام جزیرۃ العرب میں اپنا اثر و نفوذ قائم کرنے میں کامیاب ہو چکی ہے۔ اگر کوئی ناگوار حادثہ رونما نہ ہوا تو بہت جلد اسلامی سرزمینوں پر بکھیرے ہوئے یہ بیج تناور درختوں میں تبدیل ہو جائیں گے اور ہمیں ان سے اپنے مطلوبہ پھل حاصل ہوں گے۔